ماہنامہ
جہدِ حق

پاکستان کمیشن
برائے انسانی حقوق

Registered No. CPL-13

جلد نمبر 33... شمارہ نمبر 12... دسمبر 2025

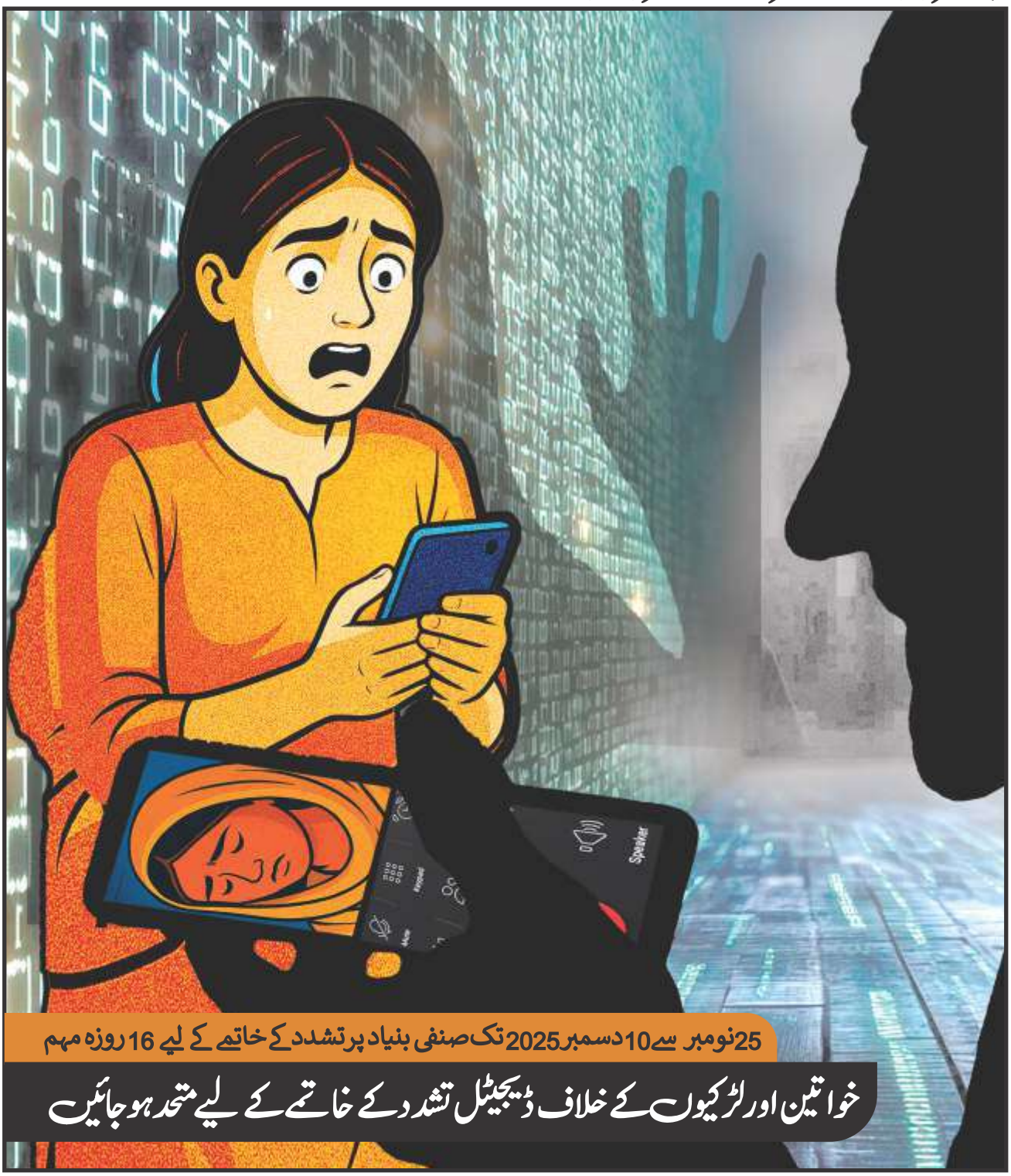

25 نومبر سے 10 دسمبر 2025 تک صنفی بنیاد پر تشدد کے خاتمے کے لیے 16 روزہ مہم

خواتین اور لڑکیوں کے خلاف ڈیجیٹل تشدد کے خاتمے کے لیے متحد ہو جائیں

☆انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے واقعات کی رپورٹ

1-وقوعہ کیا تھا:							
2-وقوعہ کب ہوا؟	سال			مہینہ		تاریخ	
3-وقوعہ کہاں ہوا؟	گاؤں				محلّہ		
	ڈاک خانہ				تحصیل وضلع		
4- کیا وقوعہ کا مقامی رسم ورواج سے تعلق ہے	ہاں				نہیں		
5-وقوعہ کیسے ہوا؟ (مختصر تفصیل)							
6-وقوعہ کا ماضی کے کسی دوسرے واقعہ سے تعلق اور اس کی مختصر تفصیل							
7-وقوعہ کا شکار ہونے والے کے کوائف	نام		ولد/زوجہ		پیشہ		
8-وقوعہ سے متاثر ہونے والے کے معاشی/سماجی حیثیت	بچہ/بچی	عورت/مرد	غریب/ان پڑھ	بوڑھا/بوڑھی	بیمار		
	مخالف سیاسی کارکن	سماجی کارکن	اقلیتی فرقے کا رکن	دیگر (تخصیص کریں)			
9-وقوعہ میں ملوث اشخاص کے کوائف:	نام	ولدیت/زوجیت	عہدہ	پیشہ			
	-1						
	-2						
	-3						
10-وقوعہ کے ذمہ دار فرد/افراد کی معاشی/سماجی حیثیت	بڑا جاگیردار/زمیندار/بہت امیر آدمی	متوسط طبقے سے/غریب آدمی	بااثر صلاحیت/سیاسی اثر ورسوخ				
11-وقوعہ کی پشت پناہی کرنے والے عناصر کے کوائف	نام اور ولدیت	عہدہ	پیشہ	پارٹی/ادارہ			
	-1						
	-2						
	-3						

12-وقوعہ سے متعلقہ فریقین گواہان وغیر جانبدار افراد کے کوائف وموقف

وقوعہ سے تعلق	نام اور ولدیت	وقوعہ سے متاثر ہونے والے کے ساتھ تعلق/رشتہ داری	عہدہ	موقف
واقعہ سے متاثر				
واقعہ کا ذمہ دار				
چشم دید گواہ				
غیر جانبدار/پڑوسی				

13-اس قسم کے واقعات علاقہ میں کس قدر ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں	بہت زیادہ	اکثر اوقات	کبھی کبھار	کبھی نہیں
14-اس قسم کے واقعات اندازاً کتنی تعداد میں ہوتے ہیں	روزانہ	ماہانہ	سالانہ	
15-وقوعہ کے بارے میں HRCP نامہ نگار/اس کے ساتھ چھان بین کرنے والے/والوں کی رائے				
رپورٹ بھیجنے والے کے کوائف:	نام	پتہ: گاؤں/محلّہ	شہر/ضلع	

انسانی حقوق کے عالمی منشور کی کس شق کی خلاف ورزی ہوئی؟

دستخط: .....

تاریخ: .....

نوٹ: اگر تفصیلات فارم پر نہ آ سکیں تو نمبر لکھ کر سادے کاغذ پر تفصیل درج کریں

☆تمام ساتھی جو انسانی حقوق کے حوالے سے رپورٹیں بھیجتے ہیں آئندہ اس فارم کی فوٹو کاپی پر کوائف لکھ کر بھیجیں

عدلیہ کی آزادی، شہری آزادیوں اور سلامتی کو لاحق خطرات باعث تشویش ہیں

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق اپنے 39ویں سالانہ عام اجلاس کے اختتام پر آئینی جمہوریت، شہری آزادیوں اور ملک بھر میں کمزور طبقات کے تحفظ کو درپیش بڑھتے ہوئے خطرات پر تشویش کا اظہار کرتا ہے۔

ایچ آر سی پی کو 27ویں آئینی ترمیم کی منظوری پر شدید تشویش ہے، جو عدلیہ کی آزادی کو کمزور کرتی ہے اور ان معاملات پر انتظامیہ کا اختیار بڑھاتی ہے جو انتظامی مداخلت سے محفوظ رہنے چاہئیں۔ عوامی اعتماد پہلے ہی کمزور ہے اور ایسے وقت میں یہ ترمیم نظامِ احتساب کو مزید کھوکھلا کر دے گی۔

سرکاری عہدے داروں کو حاصل تاحیات استثنا نے اختیارات کو چند ہاتھوں میں اس حد تک سمیٹ دیا ہے کہ پارلیمان کی بالادستی عملاً کمزور پڑ گئی ہے۔ ایچ آر سی پی اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ بااختیار اور منتخب مقامی حکومتیں جمہوریت کے استحکام اور شہریوں کی نظم و نسق میں شمولیت بڑھانے کے لیے نہایت ضروری ہیں۔

خیبر پختونخوا اور بلوچستان میں شدت پسندی کے تدارک کے اقدامات میں بنیادی آزادیوں اور اختلافِ رائے کے حق کا تحفظ لازمی ہے۔ بلوچستان اور دیگر علاقوں میں انٹرنیٹ کی طویل بندش نے تعلیم، روزگار اور جمہوری شرکت کو شدید متاثر کیا ہے جسے فوری طور پر ختم کیا جائے۔ ایچ آر سی پی وفاقی اور صوبائی حکومتوں پر زور دیتا ہے کہ حقوق کے احترام پر مبنی سیکیورٹی اقدامات اپنائیں، ریاستی اہلکاروں کی بدسلوکی کی غیر جانبدار تحقیقات کریں، اور مقامی برادریوں کے ساتھ بامعنی مشاورت کو یقینی بنائیں۔ اس میں جبری گمشدگیوں کا خاتمہ اور قانون کے معین ضابطے کے بغیر حراستی مراکز کے استعمال کا خاتمہ شامل ہے۔ اختلافِ رائے کو دبانے کے لیے شیڈول فور کا استعمال فوراً بند ہونا چاہیے۔

ایچ آر سی پی کو افغان پناہ گزینوں کی جاری ہراسانی، حراست اور جبری ملک بدری پر شدید تشویش ہے۔ ان میں سے بہت سے افراد کو ظلم و ستم، خاندان سے جدائی اور شدید انسانی بحران کے حقیقی خطرات لاحق ہیں۔ حکومت ملک بدری فوری طور پر معطل کرے، قانون کے معین طریقِ کار کے تحت سلوک کو یقینی بنائے، اور بین الاقوامی حفاظتی اصولوں پر عمل کرے۔ پاکستان کو 1951 کے اقوامِ متحدہ کے مہاجر کنونشن اور 1967 کے پروٹوکول کی توثیق کرنی چاہیے اور پیدائشی شہریت اور شہریت کے حق کا تحفظ کرنا چاہیے۔

حراستی تشدد اور ماورائے عدالت قتل، بالخصوص سی سی ڈی اور سی ٹی ڈی کے اہلکاروں کے ہاتھوں ہلاکتیں فوری آزادانہ تحقیقات اور جوابدہی کی متقاضی ہیں۔ ایسی سنگین خلاف ورزیاں سزا سے استثنا کو بڑھاتی ہیں اور شہریوں کے حقِ زندگی اور وقار کو خطرے میں ڈالتی ہیں۔

مذہبی اقلیتیں، خصوصاً احمدی برادری، ہجوم کے تشدد، عبادت گاہوں پر حملوں اور قبروں کی بے حرمتی کا مسلسل نشانہ بن رہی ہیں۔ ریاست انہیں تحفظ فراہم کرے، نفرت انگیزی اور تشدد پر اکسانے والوں کے خلاف کارروائی کرے، توہینِ مذہب کے قوانین کے غلط استعمال کی تحقیقات کے لیے طویل عرصے سے زیرِ التوا کمیشن کو فعال کرے اور جبری تبدیلیِ مذہب کے خلاف قانون سازی کرے۔

کم عمری کی شادی ایک سنگین مسئلہ بنی ہوئی ہے جو بچیوں کی صحت، تعلیم اور مستقبل کو شدید خطرات سے دوچار کرتی ہے۔ ایچ آر سی پی مطالبہ کرتا ہے کہ قوانین میں 'نابالغ' کی تعریف کو یکساں کیا جائے اور 18 سال سے کم عمر کی تمام شادیوں کو غیر قانونی قرار دیا جائے۔ تعلیمی اداروں اور دیگر سرکاری و نجی جگہوں پر جنسی ہراسانی بھی برقرار ہے؛ محفوظ ماحول کے لیے رپورٹنگ کا مضبوط نظام، شفاف احتساب، اور مؤثر تربیت لازمی ہے۔

ایچ آر سی پی حکومت پر زور دیتا ہے کہ وہ موسمیاتی تبدیلیوں کے باعث بے گھر ہونے والے افراد، خاص طور پر گلگت بلتستان میں، کے لیے محفوظ پناہ، بنیادی سہولیات اور بحالی کے مستحکم اقدامات کو یقینی بنائے۔ جنوبی پنجاب سمیت حالیہ سیلاب سے متاثرہ خاندانوں کے لیے گھروں اور روزگار کی بحالی کے لیے طویل المدتی معاونت لازمی ہے۔ پاکستانی اور بھارتی ماہی گیروں کی قید کا مسئلہ بھی فوری توجہ کا متقاضی ہے؛ انہیں اپنے اپنے ممالک واپس بھیجا جائے، انسانی سلوک، قانونی نمائندگی اور بلاجواز حراست سے تحفظ فراہم کیا جائے تاکہ ان کے بنیادی حقوق اور روزگار محفوظ رہیں۔

[پریس ریلیز۔ لاہور 24 نومبر 2025]

فہرست

پریس ریلیز 03

جب پالیسی تقسیم کرتی ہے 04

دوطرفہ لڑائی کی زد میں 07

خواجہ سراؤں کا جنم 09

وہ قبرستان، جہاں صرف 'کاریوں' کی کہانیاں دفن ہیں 11

ذہنی صحت کے مسائل کا حل قابلِ عمل تجاویز 12

ماضی کی تلخی کا سفر 12

آن لائن ہراسانی: دنیا کی 1.4 ارب خواتین قانونی تحفظ سے محروم، یو این ویمن 13

سماجی سمجھ بوجھ اور خاندان کا کردار انٹرسیکس اور ٹرانس جینڈر افراد کا فرق 14

غذائی عدم توازن: پکاتی عورت ہے، مگر کھاتا کون ہے؟ 15

کوئی بھی ملک اپنے محنت کش ملازمین کی پینشن ختم کر کے ترقی یافتہ نہیں بن سکتا 16

جب پالیسی تقسیم کرتی ہے

پاک۔افغان سرحد کی بندش کے انسانی حقوق پر منفی اثرات

پاکستان۔افغان سرحد، جو کہ تجارتی اور ثقافتی تبادلے کا ایک تاریخی راستہ ہے، حالیہ بندش کی وجہ سے اقتصادی اور سماجی مشکلات کا ذریعہ بن گئی ہے۔ان رکاوٹوں نے سرحد پار تجارت اور خونی رشتوں پر انحصار کرنے والی مقامی کمیونٹیز کے ذرائع معاش کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔اسی مناسبت سے، پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے اس تناظر میں پیدا ہونے والے مسائل کی نشاندہی کرنے کے لیے حقائق کی کھوج کا مطالعہ کرنے کی ضرورت محسوس کی، کیونکہ سرحدوں کی بندش کا بنیادی حقوق بشمول روزی روٹی، نقل وحرکت کی آزادی، خوراک کی حفاظت اور ان سرحدوں کے ساتھ رہنے والی برادریوں کے خاندانی اتحاد پر براہ راست اثر پڑتا ہے۔ محدود سرحدی پالیسیوں نے معاشی صورتحال کو گھمبیر کیا ہے اور دیرینہ سماجی اور ثقافتی تعلقات میں خلل ڈالا ہے،۔ایچ آر سی پی نے اس صورت حال کو دستاویزی شکل دی اور سیکیورٹی اسٹیٹ پر مبنی نظم ونسق کی انسانی قیمت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور ایسی پالیسیوں کی وکالت کی ہے جو وقار، مساوات اور متاثرہ آبادی کے سماجی واقتصادی حقوق کو برقرار رکھتی ہیں۔

یہ مطالعہ فیلڈ میں ہونے والے تحقیقاتی کام اور حالات کی خبر رکھنے والے لوگوں کے انٹرویوز پر مبنی ہے — جن میں مقامی کمیونٹی رہنما، سیاسی رہنما، صحافی، ماہرین تعلیم اور انسانی حقوق کے محافظ شامل ہیں۔ یہ عمل بلوچستان کے علاقوں کوئٹہ اور چمن اور خیبر پختونخواہ کے علاقوں طورخم اور پشاور میں ہوا۔ یہ تحقیقاتی کام مارچ اور جولائی 2025 کے دوران انجام پایا۔

سرحدی خطہ، جس میں زیادہ تر پشتون قبائل آباد ہیں، تاریخی طور پر تجارتی اور ثقافتی تبادلوں کی بدولت فروغ پایا اور سرحد پار کھلی راہداریوں نے اس حوالے سے بہت مثبت کردار ادا کیا۔ ٹیکسٹائل، خوراک کی مصنوعات، تعمیراتی سامان اور دستکاری جیسی اشیا کی تجارت مقامی معیشتوں کو برقرار رکھنے کے لیے لازمی رہی ہے۔ تاہم، سیکیورٹی خدشات، پالیسی میں تبدیلیاں، اور جغرافیائی وسیاسی تناؤ کی وجہ سے سرحدیں اکثر بند رہتی ہیں، بشمول طورخم، غلام خان اور چمن جیسے اہم مقامات پر۔ ان بندشوں نے معاشی کمزوریوں کو بڑھایا اور سرحد پار نقل وحرکت پر انحصار کرنے والے سماجی ڈھانچے کو درہم برہم کر دیا ہے۔

حالیہ اعداد وشمار صورتحال کی سنگینی کو واضح کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، 2020 میں افغانستان سے پاکستان برآمدات میں 29 فیصد کمی آئی اور مسلسل سرحدی رکاوٹوں کی وجہ سے اس میں تواتر کمی واقع ہو رہی تھی۔ مقامی معیشتوں پر دباؤ کی وجہ سے روزگار، وسائل اور ضروری اشیاء تک رسائی میں کمی واقع ہوئی ہے۔ سماجی طور پر، بندشوں نے ثقافتی تبادلوں میں رکاوٹ ڈالی ہے اور خاندانی بندھنوں میں تناؤ پیدا کیا ہے جو سرحد سے ماورا ہیں۔

پس منظر

پاکستان اور افغانستان کے درمیان 2,640 کلومیٹر طویل سرحد کو ڈیورنڈ لائن کہا جاتا ہے، اور اسے 1893 میں ایک برطانوی سفارت کار، سر ہنری مورٹیمر ڈیورنڈ نے افغانستان کے اس وقت کے بادشاہ عبدالرحمٰن خان کے ساتھ مذاکرات کے بعد کھینچا تھا۔ سرحد کا قیام دو اینگلو افغان جنگوں (42-1838, 80-1878) کے تناظر میں ہوا تھا جو برطانوی ہندوستانی سلطنت نے فتح کرنے کے لیے شروع کیں تھی، اور جب یہ ناکام ہوئی تو، افغانستان کو بالواسطہ طور پر کنٹرول کرنے کے لیے، جسے اس نے روسی زار شاہی کے خلاف بفر زون کے طور پر استعمال کیا، جو 'انیسویں صدی کے 'وسطی ایشیا' میں اس کا حریف تھا۔

1879 کے معاہدہ گندمک کے تحت افغانستان نے مختلف سرحدی علاقوں کا کنٹرول برطانوی ہندوستان کے حوالے کر دیا۔ اینگلو انڈین سلطنت نے پھر ان علاقوں کو دو زونوں میں منقسم کیا، یعنی شمال مغربی سرحدی صوبہ (این ڈبلیو ایف پی) اور قبائلی علاقے۔ جبکہ 2010 میں صوبہ سرحد، جس کا نام بدل کر خیبر پختونخوا رکھا گیا، کو صوبے کا درجہ دیا گیا، قبائلی علاقوں پر مرکزی حکومت ایک خصوصی قانونی نظام کے ذریعے حکومت کرتی تھی۔ یہ نظام فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن (ایف سی آر) تھا جو 1901 میں نافذ کیا گیا تھا، اور اس نے مقامی عمائدین کو اہم اختیارات فراہم کیے۔ مئی 2018 میں حکومت پاکستان نے قبائلی علاقوں کو خیبر پختونخوا میں ضم کر کے ایف سی آر کو ختم کر دیا۔

ڈیورنڈ لائن کے ساتھ زیادہ تر علاقے ناہموار پہاڑوں، گھنے جنگلوں والی وادیوں، تنگ چٹانوں کے راستوں اور بنجر صحرا کے کچھ حصوں سے گزرتے ہیں۔ کم اونچائی والے علاقوں کے ایک بہت ہی چھوٹے حصے میں زراعت کی صلاحیت ہے۔ چونکہ اس کے کچھ حصے قدیم شاہراہ قراقرم کے ساتھ واقع ہیں، اس لیے تجارت روایتی طور پر مقامی کمیونٹیز کے لیے ذریعہ معاش کا ایک بڑا ذریعہ رہی ہے۔ چونکہ ان کمیونٹیز کا آبائی وطن اس انتہائی غیر محفوظ سرحد کے دونوں طرف پھیلا ہوا تھا، اس لیے انہیں اپنے طرز زندگی کو جاری رکھنے کے لیے معاہدہ گندمک کے تحت حقِ آسائش دیا گیا تھا۔

1947 میں جب انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی سلطنت سمیٹنے کا فیصلہ کیا تو برصغیر پاک و ہند میں پاکستان ایک نئے ملک کے طور پر سامنے آیا اور اسے ڈیورنڈ لائن وراثت میں ملی۔ تب سے، یکے بعد دیگرے افغان حکومتیں سرحدی معاہدے سے یکطرفہ طور پر دستبردار ہو چکی ہیں، اور اسے برطانوی استعمار کا نشان قرار دیتی ہیں۔

تاہم، سرحد کے دونوں طرف کے قبائل کے حقوقِ آسائش جاری رہے۔ یہ حقوق روایتی طریقوں اور قبائلی اصولوں سے وابستہ تھے، جو خطے کے منفرد سماجی اور اقتصادی ڈھانچے کی عکاسی کرتے ہیں۔ان قوانین کے تحت سرحد کے دونوں جانب کے قبائل کو اپنی جائیدادوں تک رسائی، کاروبار کرنے اور سرحد پار اپنے رشتہ داروں اور قبیلوں سے سماجی طور پر جڑنے کی اجازت تھی۔

افغانستان میں 1978 کے کمیونسٹ انقلاب کے بعد شروع ہونے والی پراکسی جنگوں، اس کے بعد افغان مجاہدین اور طالبان کے عروج اور 11 ستمبر 2001 کے القاعدہ کے حملوں کے بعد امریکی افواج کی آمد کے دوران سرحدی برادریوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

مقامی برادریوں کی مشکلات بنیادی طور پر، پہلے افغان مجاہدین اور، بعد میں، 1994 کے بعد، افغانستان پر کنٹرول پانے کی جدوجہد میں، طالبان کو سہولت فراہم کرنے کی پاکستانی پالیسیوں سے پیدا ہوئیں۔ ان عسکریت پسند سرحدی علاقوں میں اپنے مراکز تھے اور یہ افغانستان میں داخل ہونے کے لیے کم استعمال ہونے والے راستے استعمال کرتے تھے۔ افغانستان میں فورسز کے جوابی حملے اکثر سرحدی برادریوں کی جان واملاک کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

تاہم، مشکل حالات سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت کے باعث یہ برادریاں زندہ رہیں اور افغان ٹرانزٹ ٹریڈ میں اپنے اہم کردار سے روزی روٹی کماتی رہیں۔ 1965 میں

دستخط کیے گئے افغانستان ٹرانزٹ ٹریڈ ایگریمنٹ (اے ٹی ٹی اے) کے تحت، پاکستان نے لینڈ لاک افغانستان کو اپنی بندرگاہوں کو ڈیوٹی فری درآمدات اور برآمدات کے لیے استعمال کرنے کی اجازت دی تھی۔ 2010 میں ایک اہم نظرثانی کے بعد، اے ٹی ٹی اے کی جگہ افغانستان پاکستان ٹرانزٹ ٹریڈ ایگریمنٹ (اے پی ٹی ٹی اے) نے لے لی اور افغانستان کو پنجاب میں واہگہ بارڈر کے ذریعے ہندوستانی منڈیوں تک زمینی رسائی دی گئی۔ طورخم اور چمن کے علاوہ، معاہدے میں ضلع شمالی وزیرستان کے علاقے غلام خان کو بھی ایک سرکاری سرحدی کراسنگ پوائنٹ کے طور پر شامل کیا گیا۔

ایک نکتہ جس پر دونوں فریقوں نے پی ٹی ٹی اے کے دوران بات چیت کے دوران اتفاق کیا تھا وہ یہ تھا کہ افغانستان پاکستان کو وسطی ایشیائی منڈیوں تک اسی طرح زمینی رسائی فراہم کرے گا۔ لیکن اس پر عمل درآمد ہونا باقی ہے، جس کی بنیادی وجہ پاکستان کی طرف سے افغان ٹرکوں کو واہگہ بارڈر سے آگے بھارت کی اٹاری مارکیٹ تک رسائی یا ہندوستانی تجارتی سامان افغانستان واپس جانے کی اجازت دینے سے انکار ہے۔ اس پر اب بھی بات چیت جاری ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، طورخم، غلام خان، چمن، اور کچھ دوسرے مقامات جیسے اہم ٹرانزٹ راستوں پر مارکیٹیں، قدیم شاہراہ ریشم کے دور سے ہی مقامی کمیونٹیز کے لیے ذریعہ معاش کا اہم ذریعہ تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مواقع بڑھتے چلے گئے۔ مقامی لوگ زیادہ تر مزدوری کے کام، ریڑھی بانی، دکانیں اور ریستوراں چلانے، تجارتی مراکز اور مکینیکل ورکشاپس میں ملازمتیں کرنے اور روزانہ کچھ منافع کمانے کے لیے تجارتی سامان سرحد پار لے جانے میں مصروف ومشغول تھے۔ یہ مؤخرالذکر سرگرمی، جو بنیادی طور پر مقامی قبائل کے غریب طبقوں کی بقا کا ذریعہ تھی، افغانستان میں 1979 کی کمیونسٹ بغاوت کے بعد 'اسمگلنگ' کے طور پر جانی پہچانی گئی، جس کی وجہ سے پاکستان نے سخت سرحدی کنٹرول نافذ کرنا شروع کیا۔ لیکن زندگی جاری رہی، منشیات فروش اپنی کھیپ سرحد کے اِس پار یا تو مختلف راستوں سے یا سرحدی اہلکاروں کو رشوت دے کر لے جاسکتے تھے۔

امریکہ میں 9/11 کے حملوں کے بعد بین الاقوامی افواج کی آمد نے سرحدی تجارت کو فروغ دیا۔ کمیونٹیز کی بقا کے لیے مشکلات کا آغاز 2014 میں ہوا جب، پشاور کے آرمی پبلک اسکول (اے پی ایس) پر دہشت گرد حملے کے بعد، پاکستانی فوج نے سرحد پار سے نقل وحرکت کو مزید مشکل بنانے کے لیے ڈیورنڈ لائن کے ساتھ خندقیں کھودنا شروع کر

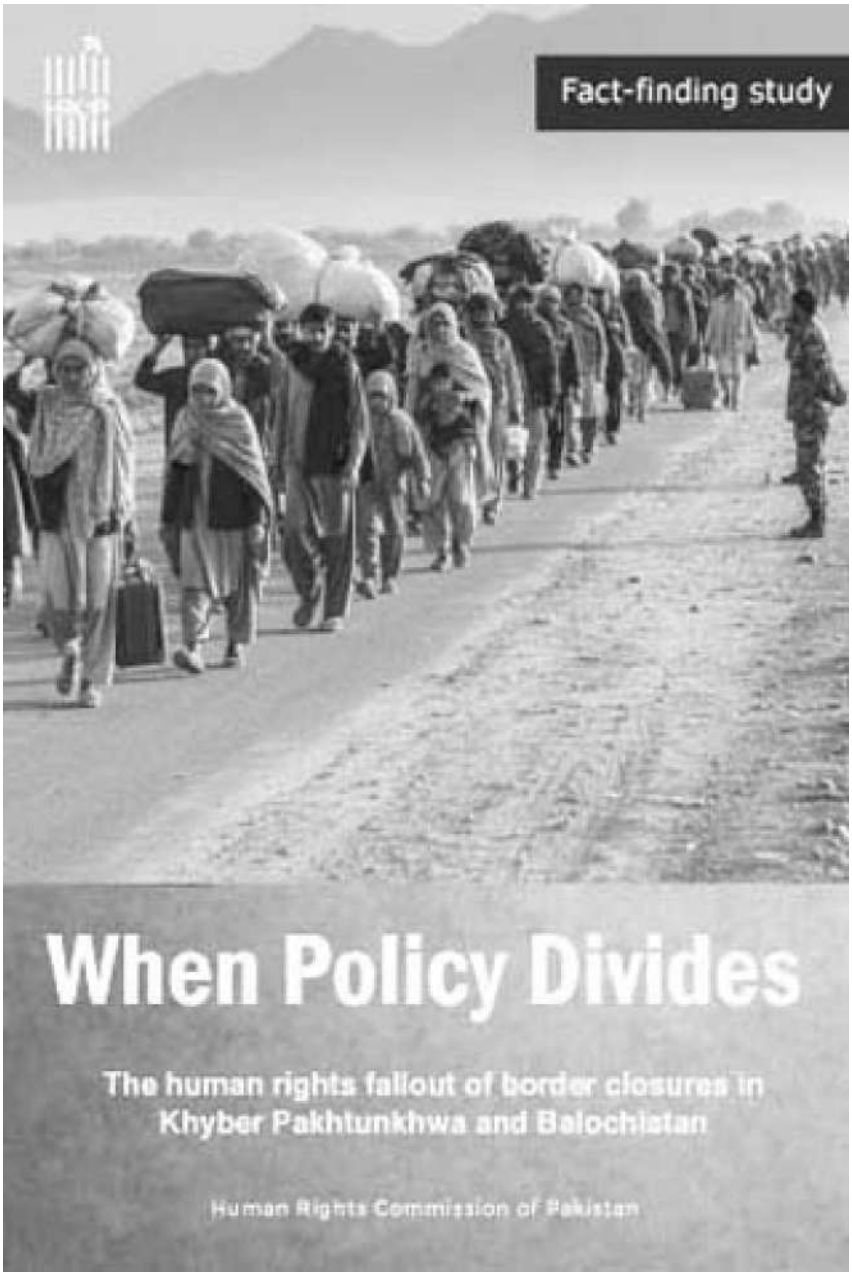

دیں۔ امریکی حمایت یافتہ افغان حکومت نے اس اقدام کی مخالفت کی، لیکن پاکستان نے دلیل دی کہ وہ دہشت گردوں کی نقل وحرکت، سرحد پار سے اسمگلنگ، اور منشیات اور انسانی سمگلروں کے بہاؤ کو مؤثر طریقے سے کنٹرول کرنا چاہتا ہے۔

2017 میں، پاکستانی حکام نے پوری سرحد پر باڑ اور مخصوص جگہوں پر تجارتی ٹرانزٹ گیٹ لگانے شروع کر دیے۔ پاکستان نے سرحدی لائن کے ساتھ خاردار باڑیں لگانا شروع کیں۔ باڑوں میں دو میٹر کا فاصلہ تھا اور اونچائی میں تقریباً تین میٹر تھیں۔ زیادہ تر سرحد پر 2021 کے آخر تک باڑ لگا دی گئی جب نیٹو افواج وہاں سے چلی گئیں، اور اقتدار طالبان حکومت کے ہاتھ آ گیا جس نے ملک کے نازک جمہوری ڈھانچے کو ختم کرنے میں بہت کم وقت ضائع کیا۔

2022 سے، پاکستان نے کئی مواقع پر افغان تجارت کے لیے سرحد بند کی ہے۔ پاکستان کا کہنا ہے کہ دہشت گرد گروپوں جیسے کہ تحریک طالبان پاکستان اور اسلامک اسٹیٹ خراسان کے ساتھ ساتھ بلوچ علیحدگی پسندوں کی مبینہ طور پر افغانستان میں پناہ گاہیں ہیں اور انہیں افغانستان کی حمایت حاصل ہے اور پاکستان کے ان اقدامات کا مقصد ایسی دہشت گردانہ کارروائیوں کا مقابلہ کرنا ہے۔

اکتوبر 2023 کے بعد سے، پاکستانی سرحد پر "ایک دستاویزی نظام" جس میں سرحد پار کے لیے پاسپورٹ اور ویزا کی ضرورت ہوتی ہے، نے سرحد کی بندش کے عمل کو تقویت دی، اس بار مقامی برادریوں کے اراکین کی جانب سے شروع کیے گئے دھرنوں اور احتجاج کی وجہ سے جس میں

انہوں نے نئے اصول کی وجہ سے اپنی مالی بقا اور سماجی ثقافتی روابط میں پیدا ہونے والی پیچیدگیوں پر تشویش کا اظہار کیا۔

بہت سے مبصرین کا خیال ہے کہ پاکستان کی جانب سے اس طرح کے حالات اور سرحدی رکاوٹوں کا مقصد کابل میں حکومت پر دباؤ ڈالنا ہے کہ وہ ڈیورنڈ لائن کو ایک جائز سرحد کے طور پر تسلیم کرے، جسے طالبان نے تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ افسوس کے ساتھ، اس جیوسٹریٹیجک کشمکش نے سرحدی برادریوں کے لیے مشکل حالات پیدا کر دیے ہیں۔

ماحصل اور سفارشات

سرحدی علاقوں میں محفوظ ماحول اور کمیونٹی کی فلاح و بہبود کی بحالی کے لیے پہلے قدم کے طور پر ریاستی پالیسی کو مرکزی سطح پر نئے سرے سے وضع کیا جائے۔ اس کا مطلب ایران، افغانستان اور بھارت کے ساتھ تجارت، عوامی رابطے اور ثقافتی روابط کے فروغ کے ذریعے تعلقات کو مضبوط بنانا ہے۔ خاص طور پر، افغانستان اور پاکستان کو مستقل، بامعنی مذاکرات میں داخل ہونا چاہیے اور اپنے لوگوں کی زندگیوں اور معاش کو لاحق خطرات سے نمٹنے کے لیے باہمی طور پر قابل قبول منصوبوں پر کام کرنا چاہیے۔

ادارہ جاتی احتساب کا استحکام

خاص طور پر پاکستان میں، ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک کلیدی عنصر ہے کیونکہ سرحد پار غیر قانونی نقل و حرکت کا موجودہ نظام ادارہ جاتی بدعنوانی کو فروغ دیتا ہے۔

مزید برآں، پاک-افغانستان بارڈر کمیشن کو ایران کے ساتھ بارڈر مینجمنٹ سسٹم کی طرح دوبارہ فعال کیا جائے، تاکہ دونوں اطراف کے حکام لوگوں کے تاریخی حقوق کی حفاظت کو یقینی بنانے کے لیے مؤثر نظام وضع کریں۔

سرحدی برادریوں کے لیے شناختی کارڈ

ایچ آر سی پی تجویز کرتا ہے کہ پاکستان اور افغانستان مشترکہ طور پر سرحد پار سے نقل و حرکت کی سہولت فراہم کرنے کے لیے متفقہ فریم ورک تشکیل دیں کیونکہ ان لوگوں کی سماجی، ثقافتی اور اقتصادی زندگی سرحد کے دونوں اطراف میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس فریم ورک میں شناختی کارڈز کی دو قسمیں شامل ہونی چاہئیں: سماجی رابطے اور چھوٹے پیمانے پر مقامی تجارت کے لیے 'راہداری (سفری)' کارڈز، اور سرحد پار مزدوروں کے لیے 'لیبر' کارڈز۔

یہ کارڈز کمیونٹی کی جانب سے تصدیقی طریقہ کار کے ذریعے جاری کیے جائیں۔ اس تصدیقی عمل میں دونوں اطراف کے قبائلی عمائدین شامل ہوں، جو تصدیق کے لیے جوابدہ ہوں تاکہ کارڈز کا ناجائز استعمال نہ ہو سکے۔ شفاف اور قانونی نقل و حرکت کو یقینی بنانے کے لیے، تصدیق شدہ کارڈ ہولڈرز کے لیے ہر قبائلی علاقے میں وقف سرحدی ٹرانزٹ گیٹ قائم کیے جائیں۔

کارڈ ہولڈرز کو پاسپورٹ یا ویزے کی شرط کے بغیر سرحد پار اپنے روایتی قبائلی علاقوں میں آزادانہ نقل و حرکت کی اجازت ہونی چاہیے۔ رسمی سفری دستاویزات کی ضرورت صرف اس وقت ہونی چاہیے جب افراد ان متعین قبائلی علاقوں سے باہر سفر کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ مثال کے طور پر، افغانستان کے صوبہ ننگرہار میں رہنے والے شنواری اور آفریدی قبائل کے افراد کو پاکستان کے خیبر ضلع میں جمرود تک بغیر ویزے کے سفر کی اجازت ہونی چاہیے، جب کہ ویزے کی شرط صرف پشاور اور اس سے آگے کے سفر کے لیے ہونی چاہیے۔ اس طرح کا نظام تاریخی و ثقافتی روابط کو محفوظ رکھے گا، سرحدوں کی بندش کی وجہ سے پیدا ہونے والی معاشی مشکلات کو کم کرے گا، اور سرحدی برادریوں اور ریاستی حکام کے درمیان اعتماد اور تعاون کو فروغ دے کر قیام امن میں اہم کردار ادا کرے گا۔

مقامی لوگ زیادہ تر مزدوری کے کام، ریڑھی بانی، دکانیں اور ریستوراں چلانے، تجارتی مراکز اور مکینیکل ورکشاپس میں ملازمتیں کرنے اور روزانہ کچھ منافع کمانے کے لیے تجارتی سامان سرحد پار لے جانے میں مصروف و مشغول تھے۔ یہ مؤخرالذکر سرگرمی، جو بنیادی طور پر مقامی قبائل کے غریب طبقوں کی بقا کا ذریعہ تھی، افغانستان میں 1979 کی کمیونسٹ بغاوت کے بعد 'اسمگلنگ' کے طور پر جانی پہچانی گئی، جس کی وجہ سے پاکستان نے سخت سرحدی کنٹرول نافذ کرنا شروع کیا۔ لیکن زندگی جاری رہی، منشیات فروش اپنی کھیپ سرحد کے اِس پار یا تو مختلف راستوں سے یا سرحدی اہلکاروں کو رشوت دے کر لے جاسکتے تھے۔

سرحدی تجارتی زونز کا قیام

پاکستان اور افغانستان کو قانونی تجارت، روزگار اور مقامی اقتصادی ترقی میں سہولت فراہم کرنے کے لیے سرحد کے ساتھ متفقہ مقامات پر مشترکہ طور پر سرحد پار تجارتی زونز قائم کرنے چاہئیں۔ ان زونز کو اشیا کی درآمد، پروسیسنگ، ذخیرہ اندوزی اور تجارت کے لیے منظم ماحول فراہم کیا جائے جس سے دونوں ملکوں اور سرحدی برادریوں کو فائدہ پہنچے۔

مقامی آبادیوں کے حقِ آسائش کے تحفظ کے لیے، کسٹم پوسٹیں قبائلی علاقوں کی بجائے ان کے خارجی مقامات پر قائم کی جائیں۔ یہ اس بات کو یقینی بنائے گا کہ سرحدی علاقوں کے باشندوں کی روایتی نقل و حرکت اور روزی روٹی بغیر کسی رکاوٹ کے برقرار رہے

ماضی کے ماڈلز کی بحالی

پشاور کے قریب باڑہ اور کارخانو بازار جیسے کاروباری مراکز سرحد پار اقتصادی سرگرمیوں کو بحال کرنے میں مدد کر سکتے ہیں جو عسکریت پسندی اور عدم تحفظ کی وجہ سے بری طرح متاثر ہوئی تھیں۔ حکومت کو چمن میں مجوزہ ٹیکس فری تجارتی زون کے قیام سمیت کیے گئے تمام وعدوں کی پاسداری کرنی چاہیے۔ چمن میں 300 سے 400 دکانوں کی تعمیر کی منصوبہ بندی کی گئی تھی لیکن ان پر عمل درآمد نہیں ہوا۔

شفاف ریگولیشن، انفراسٹرکچر سپورٹ، اور کمیونٹی کی شرکت کے ذریعے ان منڈیوں کو اداروں کی شکل دے کر، دونوں ریاستیں بے ضابطہ تجارت میں کمی لا سکتی ہیں، مقامی روزگار کے مواقع پیدا کر سکتی ہیں، اور تاریخی طور پر ایک دوسرے پر منحصر خطوں میں سرحد پار اعتماد کو مضبوط کر سکتی ہیں۔

بے گھر لوگوں کی آبادکاری

حکومت پاکستان کو چاہیے کہ وہ تمام پاکستانی شہریوں اور ان کی دستاویزات کا جامع جائزہ لے جو کہ انسداد دہشت گردی کی کارروائیوں، سرحد پر باڑ لگنے، یا پاک-افغان سرحد پر سیکیورٹی سے متعلق بنیادی ڈھانچے کی ترقی کے نتیجے میں بے گھر ہوئے ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کی عدم موجودگی سے ان متاثرہ آبادیوں کی شناخت اور ان کی شکایات کے ازالے میں تاخیر ہوئی ہے۔

ایچ آر سی پی حکام پر یہ زور بھی دیتا ہے کہ وہ ان افراد کے لیے معاوضے کا شفاف طریقہ کار تیار کریں اور اس پر عمل درآمد کریں جن کے گھر، دکانیں، یا زمینیں تباہ ہوئیں، قبضے کا شکار ہو گئیں، یا سیکیورٹی تنصیبات، برآمدی ٹرمینلز، یا دیگر ریاستی مقاصد کے لیے دوبارہ ریاستی تحویل میں لے لی گئیں۔ جہاں ممکن ہو، جائیدادیں خالی کر کے ان کے حقیقی مالکان کو لوٹائی جائیں۔

اس حوالے سے جوابدہی، شفافیت، اور کمیونٹی کی شرکت کے اصولوں سے رہنمائی لی جائے، اس بات کو یقینی بناتے ہوئے کہ تمام متاثرہ خاندانوں کو مناسب معاوضہ اور بحالی کی مدد ملے۔ شہریوں کے آئینی حقوق کو برقرار رکھنے، ریاستی اداروں پر اعتماد بحال کرنے اور سرحدی علاقوں میں طویل مدتی استحکام کو فروغ دینے کے لیے نقل مکانی کو تسلیم کرنا اور اس مسئلے کو حل کرنا ضروری ہے۔

☆☆☆

دوطرفہ لڑائی کی زد میں

خیبر پختونخوا میں سلامتی اور انصاف کا بحران

2025 میں پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کے مشاہدے میں یہ تشویش ناک صورت حال آئی کہ خیبر پختونخوا میں سیکیورٹی اور امن وامان کے حالات بدستور غیر مستحکم ہیں۔ اس امر کی نشاندہی عسکریت پسندوں کے مسلسل حملوں اور انسداد دہشت گردی کی کارروائیوں سے ہو رہی تھی۔ اسلام آباد میں قائم پاکستان انسٹی ٹیوٹ فار کنفلیکٹ اینڈ سیکیورٹی اسٹڈیز نے رپورٹ کیا کہ صرف جولائی 2025 میں ملک بھر میں کم از کم 82 عسکریت پسند حملے ہوئے، جن میں سے دو تہائی حملے خیبر پختونخوا بشمول اس کے سابقہ قبائلی اضلاع میں ہوئے۔

صوبے میں سیکیورٹی، امن وامان کی بگڑتے ہوئے حالات اور انسانی حقوق کی مجموعی صورت حال کے حوالے سے بڑھتے ہوئے خدشات کے پیشِ نظر، ایچ آر سی پی نے 24 سے 26 ستمبر 2025 تک پشاور میں ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن کا اہتمام کیا۔ مشن کی قیادت ایچ آر سی پی کے چیئرپرسن اسد اقبال بٹ اور شریک چیئرمنیز جہانگیر نے کی۔ خیبر پختونخوا چیپٹر کے وائس چیئر اکبر خان، ایچ آر سی پی کے خزانچی اور سینئر صحافی حسین نقی، ماہر تعلیم اور محقق ڈاکٹر صبا گل خٹک، اور ایچ آر سی پی کے عملے کے ارکان شاہد محمود اور سلمان فرخ بھی مشن کا حصہ تھے۔

ذیل میں مشن کے اہم مشاہدات اور سفارشات بیان ہیں۔

مشن کے مشاہدات

مشن کی رائے میں وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان وسیع تر سیاسی اتفاق رائے اور بہتر ہم آہنگی ضروری ہے تاکہ سیکورٹی کی موجودہ صورتحال بالخصوص ضم شدہ اضلاع میں سیکیورٹی کے مسائل حل کیے جاسکیں۔ مزید برآں، احتسابی نظام کی عدم موجودگی نے فوجی کارروائیوں کو لوگوں کے بنیادی حقوق، خاص طور پر ان کے زندگی کے حق کو بری طرح پامال کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ یہ ستمبر 2025 میں تیراہ میں رپورٹ ہونے والی کارروائیوں کے معاملے میں واضح ہے۔ جس کے بارے میں اس وقت کے وزیر اعلیٰ، علی امین گنڈاپور نے دعویٰ کیا تھا کہ انہوں نے ان کارروائیوں کی اجازت نہیں دی تھی، جن کے نتیجے میں بچوں سمیت عام شہریوں میں نمایاں جانی نقصان ہوا۔

مشن کو یہ جان کر تشویش ہوئی کہ صوبائی پولیس اور قانون نافذ کرنے والے دیگر سویلین ادارے اپنے قانونی مینڈیٹ کے مطابق امن وامان سے متعلق فیصلے کرنے کے لیے مؤثر طور پر با اختیار نہیں اور نہ ہی وہ صوبے میں سیکیورٹی چیلنجز سے نمٹنے کے

مشن نے عوام کو اپنے نتائج سے آگاہ کرنے کے لیے پشاور میں ایک پریس کانفرنس کی

لیے ضروری وسائل سے لیس ہیں۔ بلکہ وفاقی حکومت کے ذریعے فوج کی مداخلت (آئین کے مطابق رضاکارانہ درخواست کی عدم موجودگی میں) نے فوجی کارروائیوں کے خلاف بڑے پیمانے پر عوامی غم وغصے کو جنم دیا ہے۔ خاص طور پر، اس کے نتیجے میں تعلیم اور صحت کی سہولیات کی فراہمی بند ہوئی اور غریب مزدوروں کی روزی روٹی کا نقصان ہوا ہے۔ مزید برآں، اس طرح کی کارروائیوں کے دوران لوگوں کی ان کے گھروں سے بار بار نقل مکانی سے متاثرہ کمیونٹیز کے لیے طویل مدتی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

ایکشنز اِن ایڈ آف سول پاور آرڈیننس 2019 کا مسلسل وجود، جو ضم شدہ اضلاع میں حراستی مراکز کو مؤثر طریقے سے قانونی تحفظ فراہم کرتا ہے، آئین کے آرٹیکل 10 اور 10(الف) کی سنگین خلاف ورزی ہے، جو غیر قانونی حراست، حراستی تشدد اور ماورائے عدالت قتل کے خلاف تحفظ کی ضمانت دیتے ہیں۔

جبری گمشدگیوں کا تسلسل خطرے کی گھنٹی ہے۔ مشن کو سنائی گئی شہادتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جن افراد پر 'ریاست مخالف' سرگرمیوں کا الزام ہے، انہیں اکثر آئینی ضمانتوں کے مطابق عدالتوں میں پیش نہیں کیا جاتا۔

مشن کا مشاہدہ ہے کہ پی ٹی ایم جیسی حقوق پر مبنی تحریکوں (بشمول اراکین کی نقل وحرکت اور اجتماع کی آزادی پر من مانی پابندیاں) اور اے این پی جیسی ترقی پسند پارٹیوں سے مبینہ سیاسی انتقام جمہوری سیاست کے لیے نقصان دہ ہے۔ بلکہ، پرامن سیاسی اختلاف کو جگہ دینا صوبے میں مذہبی اور انتہا پسندی کی دیگر اقسام کا مقابلہ کرنے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے، جس کے نتیجے میں قومی سلامتی کو تقویت ملتی ہے۔

کرم میں سیکورٹی کی نازک صورتحال، جہاں دیرینہ زمینی اور فرقہ وارانہ تنازعات استحکام میں رکاوٹ بنتے رہتے ہیں، تشویش کا باعث ہے۔ مشن کو ان رپورٹوں سے بہت تشویش ہے کہ وقفے وقفے سے راستے کی بندش نے ضروری سامان اور خدمات کی فراہمی میں خلل ڈالا ہے اور مقامی ذرائع معاش کو محدود کر دیا ہے، خاص طور پر وہ لوگ جو سرحد پار تجارت پر منحصر ہیں۔

مشن کو صحافیوں، خاص طور پر جبری گمشدگیوں اور عسکریت پسندوں کے تشدد کو رپورٹ کرنے والوں پر سنسرشپ، دھمکیوں اور ٹارگٹ حملوں کی تشویشناک اطلاعات موصول ہوئیں۔ ایسی شہادتیں بھی ہیں جن میں یہ الزام لگایا گیا ہے کہ ضم شدہ اضلاع میں میڈیا سے منسلک افراد پر ریاستی یا غیر ریاستی اہلکاروں نے اپنے علاقے چھوڑنے کے لئے دباؤ ڈالا جس سے آزادانہ رپورٹنگ اور آئینی طور پر محفوظ آزادیوں کا استعمال بہت زیادہ متاثر ہوا ہے۔

مشن سے ملاقات کرنے والوں نے صوبے میں کانوں اور معدنیات کے بندوبست، این ایف سی ایوارڈ اور انضمام شدہ اضلاع کے لیے فنڈز مختص کرنے کے حوالے سے بہت زیادہ خدشات کا اظہار کیا۔ عوام کو خدشہ ہے کہ انضمام شدہ اضلاع کی حیثیت کو تبدیل کیا جاسکتا ہے، اس طرح محدود احتساب اور

انصاف تک محدود رسائی والا علاقہ دوبارہ قائم کیا جا سکتا ہے، اس خدشے کو سنجیدہ لیا جائے۔ متعدد لوگوں نے عسکریت پسندی کے موجودہ مرحلے کو معدنی وسائل پر کنٹرول حاصل کرنے کی ریاستی کوششوں سے جوڑا ہے جس سے بے گھر ہونے والی مقامی کمیونٹیز کے مفادات نظر انداز ہوئے ہیں۔ یہ کمیونٹیاں گھروں، اسکولوں اور ضروری شہری بنیادی ڈھانچے کو پہنچنے والے نقصان سمیت اہم سماجی و معاشی نقصانات برداشت کر رہی ہیں۔

سفارشات

فیکٹ فائنڈنگ کے نتائج کی بنیاد پر، مشن نے درج ذیل سفارشات پیش کیں:

فوجی کارروائیوں کی منظوری صرف مقامی کمیونٹیز کے ساتھ مکمل اور شفاف مشاورت کے بعد اور صوبائی و قومی اسمبلیوں میں بحث کے ذریعے دی جانی چاہیے۔ اس طرح کی حکمتِ عملی میں نیشنل ایکشن پلان میں بہتری لانا اور صوبے کی سلامتی اور امن سے متعلق معاملات میں افغانستان کے حکام کے ساتھ رابطہ سازی کی بہتری شامل ہونی چاہیے۔ تاہم، اس سلسلے میں وفاقی حکومت کی جانب سے صوبائی حکومت کو جو بھی اختیارات تفویض کیے گئے ہیں، ان کا استعمال قانون اور آئین کی حدود میں رہ کر کرنا چاہیے۔

ریاست کو فوجی کارروائیوں سے متاثرہ یا بے گھر ہونے والے تمام افراد کی فلاح و بہبود اور بحالی کے لیے مناسب وسائل مختص کرنے چاہئیں، جن میں بچوں، خواتین، بزرگوں اور مذہبی اقلیتوں جیسے کمزور گروہوں پر خصوصی توجہ دی جائے۔ تمام اندرونی طور پر بے گھر ہونے والے افراد کو معاوضہ دیا جانا چاہیے، دوبارہ آباد کیا جانا چاہیے اور ان کی عزت کے بنیادی حق کا تحفظ کیا جانا چاہیے، اس مقصد کے لیے وفاقی اور صوبائی دونوں حکومتیں مناسب فنڈز کی فراہمی کو یقینی بنائیں۔

صوبائی حکومت جیسا کہ نومنتخب وزیراعلیٰ سہیل آفریدی نے کہا ہے، ایکشن (ان ایڈ آف سول پاور) آرڈیننس 2019 کو فوری طور پر منسوخ کرے اور پشاور ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں دائر اپنی اپیل واپس لے۔

صوبے کے تمام حراستی مراکز کو ناکارہ کر دیا جانا چاہیے اور ان میں زیرِ حراست افراد کو سویلین جیلوں میں منتقل کر کے مقدمے کی سماعت کے لیے سول عدالتوں کے سامنے لایا جانا چاہیے۔ عام شہریوں کے باضابطہ قانونی کارروائی اور منصفانہ ٹرائل کے حق کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی بھی عام شہری پر فوجی عدالتوں میں مقدمہ نہ چلایا جائے۔

جبری گمشدگی کے تمام کیسز کو ترجیحی بنیادوں پر نمٹایا جانا چاہیے تاکہ متاثرین کی بازیابی اور ان کے باضابطہ قانونی کارروائی کے حق کو یقینی بنایا جا سکے۔ پشاور ہائی کورٹ کو اس حوالے سے اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ ریاست کو جبری گمشدگیوں کا سلسلہ بند کرنا چاہیے اور اس کے بجائے صوبائی پولیس کو امن و امان کی بحالی کے لیے قانونی ذرائع استعمال کرنے کا اختیار دینا چاہیے۔

مشن کے اراکین وزیراعلیٰ علی امین گنڈہ پور کے ساتھ ملاقات کر رہے ہیں

سی سی آئی جیسے آئینی اداروں کو ایسی اعلیٰ کمیٹیوں سے تبدیل نہیں کیا جانا چاہیے، جن میں جمہوری اداروں میں موجود احتساب کا فقدان ہے۔

وفاقی حکومت کو اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ خیبر پختونخوا کو آئین کے مطابق ایک نیا این ایف سی ایوارڈ دینے کے لیے جلد از جلد سی سی آئی کا اجلاس بلایا جائے۔ انضمام شدہ اضلاع کی ترقی کے لیے جن فنڈز کا وعدہ کیا گیا ہے، وہ صوبائی حکومت کو فوری طور پر جاری کیے جائیں۔ صوبے میں پیدا ہونے والی ہائیڈل پاور اور تمباکو پر محصول سمیت تمام مالی معاملات کو آئینی نظام کے اندر رہ کر طے کیا جانا چاہیے۔ ریاست اس بات کو یقینی بنائے کہ تمام شہری ریاستی و غیر ریاستی عناصر کے خوف کے بغیر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لے سکیں۔ ریاست منظور پشتین، محسن داوڑ اور علی وزیر جیسے سیاسی رہنماؤں کو بدنام کرنے سے بھی گریز کرے۔ ان لوگوں نے خطے میں امن کے لیے مسلسل جدوجہد کی ہے۔

صوبائی حکومت کو سیاسی جماعتوں کے کارکنوں اور امن کے حامیوں، خاص طور پر قبائلی عمائدین یا مشران کی حفاظت کو یقینی بنانا چاہیے، جنہیں غیر ریاستی عناصر سے خطرہ لاحق ہے، بشمول ایک ایسے طریقہ کار کے ذریعے جو حکومت کو ان کی حفاظت سے متعلق اہم معلومات شیئر کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

باجوڑ میں اے این پی کے رہنما مولانا خان زیب کی ٹارگٹ کلنگ کی تحقیقات ہونی چاہیے اور مجرموں کا سراغ لگا کر ان کا محاسبہ کیا جانا چاہیے۔

ریاست کو غیر ریاستی عناصر کو صوبے کے امن و استحکام کو متاثر کرنے کی اجازت دینے کے عمل میں ملوث نہیں ہونا چاہیے۔ متعلقہ حکام کو چاہیے کہ ایسے کسی بھی تاثر یا الزامات کو دور کریں۔ ریاست کو انسانی حقوق کے کارکنوں، صحافیوں اور سیاسی کارکنوں کے خلاف تعزیرات پاکستان کے سیکشن A-124 (غداری کا جرم) کا من مانا استعمال بند کرنا چاہیے۔ وفاقی اور صوبائی حکام قدرتی وسائل پر صوبے اور مقامی کمیونٹیز کے استحقاق کو مکمل تحفظ حاصل فراہم کریں۔ کانوں اور معدنیات سے متعلق کسی بھی پالیسی کی تشکیل اور نفاذ آئینی دفعات کے ساتھ، بشمول صوبائی رضامندی کی مطابقت میں ہو۔

کرم میں سیکورٹی کی صورت حال کو پوری مستعدی اور بغیر تاخیر کے حل کیا جانا چاہیے، خاص طور پر دیرینہ زمینی اور فرقہ وارانہ تنازعات کو حل کرنے پر توجہ دی جائے۔ خوراک، طبی سامان اور دیگر بنیادی خدمات کی ترسیل کے لیے تمام ضروری راستے کھلے رہیں۔ معمولات کی بحالی کی کوششوں میں تمام متعلقہ فریقین کے ساتھ مسلسل رابطہ سازی شامل ہونی چاہیے، اس بات کو یقینی بناتے ہوئے کہ معاشی سرگرمیاں، خاص طور پر جو سرحد پار تجارت سے منسلک ہیں، جاری رہیں تاکہ مقامی ذرائع معاش کی حفاظت اور وسیع تر معیشت کو سہارا دیا جا سکے۔

خیبر پختونخوا میں شہریوں کو اضافی نقصان نہ سمجھا جائے۔ تمام سیکورٹی آپریشنز میں شہریوں کے تحفظ کو ترجیح دینی چاہیے، باضابطہ قانونی کارروائی کو برقرار رکھنا چاہیے اور کسی بھی نقصان کی صورت میں جوابدہی کو یقینی بنانا چاہیے۔ ریاست کو پالیسی کی سطح پر اور عملی طور پر بھی اس بات کی توثیق کرنی چاہیے کہ اس کے لوگوں کی زندگیاں اور حقوق ناقابلِ سمجھوتہ ہیں۔

اظہار تشکر

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) یہ تحقیقی مشق انجام دینے پر الیاس خان کا تہہ دل سے مشکور ہے۔ ہم فیروزہ بتول اور سنی ضیاء کا شکریہ ادا کرنا چاہیں گے کہ انہوں نے اس تحقیقی مطالعہ کی تیاری کا انتظام کیا۔ اور فرح ضیاء اور ماہین پراچا اس کا جائزہ لیا۔ ہم رپورٹ کی ادارت پر عرفان خان اور سرورق ڈیزائن کرنے اور لے آؤٹ کے لیے رد افضل کے بھی مشکور ہیں۔

☆☆☆

خواجہ سراؤں کا جہنم:

خیبر پختونخوا جہاں مقتولین کو دفنانے تک کی اجازت نہیں ملتی

خالدہ نیاز

بائیس سالہ برفی قاتلانہ حملے میں بچ تو گئیں لیکن اب شاید کبھی ڈانس نہ کر پائیں۔ ان کا تعلق ضلع سوات سے ہے لیکن ایک عرصے سے وہ پشاور میں مقیم ہیں۔ 17 جولائی کو وہ ایک تقریب سے واپس آ رہی تھیں جب ان پر فائرنگ کی گئی۔

"میرے گرو سے کچھ لوگوں نے 50 لاکھ روپے بھتہ مانگا تھا۔ ظاہر ہے وہ اتنی بڑی رقم نہیں دے سکتے تھے۔ اس پر انہوں (بھتہ خوروں) نے مجھے نشانہ بنایا۔ پہلے بھی گرو سے 25 لاکھ بھتہ وصول کیا جا چکا ہے۔"

برفی کو تین گولیاں لگیں اور وہ تب سے بستر پر ہیں۔

"خواجہ سراؤں کی کمائی کا واحد ذریعہ ناچ گانا ہے۔ ہم میں سے جب کوئی معذور ہو کر کام کرنے کے قابل نہیں رہتا تو زندگی بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ ہمارا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ آخر کہاں جائیں؟"

جو خواجہ سرا ایسے حملوں میں بچ جاتے ہیں انہیں علاقہ بدر ہونا پڑتا ہے۔

ٹرانس ایکشن الائنس خیبر پختونخوا کی صدر فرزانہ ریاض کے مطابق صوبے میں پچھلے دس سال کے دوران 157 خواجہ سراؤں کو قتل کیا گیا۔ رواں سال ان واقعات میں مزید شدت دکھائی دی ہے۔

خیبر پختونخوا پولیس تصدیق کرتی ہے کہ رواں سال کے ابتدائی سات ماہ میں 15 خواجہ سرا قتل کیے گئے جن میں مردان میں چھ، پشاور پانچ، چارسدہ تین اور ایبٹ آباد میں ایک قتل ہوا۔ ستمبر میں پشاور میں ایک اور خواجہ سرا کی ہلاکت رپورٹ ہوئی ہے۔

علاوہ ازیں صوابی میں ایک خواجہ سرا کی خودکشی کا واقعہ بھی سامنے آیا جسے مسلسل ہراسانی کا نتیجہ بتایا جاتا ہے۔

"اب صرف گولی سے خوف آتا ہے، بدسلوکی، مار پیٹ کے تو ہم عادی ہو چکے ہیں"

فرزانہ ریاض کا ادارہ - ٹرانس ایکشن الائنس - خواجہ سراؤں کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے کے ساتھ انہیں تعلیم و ہنر اور قانونی معاونت بھی فراہم کرتا ہے۔ وہ بتاتی ہیں کہ پچھلے 10 سال میں چترال سے ڈیرہ اسماعیل خان تک خواجہ سراؤں کے ساتھ ریپ، بھتہ، ضلع بدری، بال کاٹنے سمیت تشدد کے تین ہزار سے زائد واقعات ہو چکے ہیں

رواں سال اب تک بدسلوکی اور دھمکیوں سے تنگ 27 خواجہ سرا ملک چھوڑ کر جا چکے ہیں جبکہ 25 سے زائد پنجاب یا دوسرے علاقوں میں نقل مکانی پر مجبور ہو گئے ہیں۔

وہ کہتی ہیں کہ خواجہ سرا کسی قسم کے جرم میں ملوث نہیں ہوتے پھر بھی تشدد کا نشانہ بنتے ہیں، قتل کر دیے جاتے ہیں۔ ان کا ریپ ہوتا ہے نازیبا ویڈیوز بنائی جاتی ہیں اور پھر قصور وار بھی انہیں کو ٹھہرایا جاتا ہے۔

خواجہ سرا نمکین پشاوری لوک سجاگ کو بتاتی ہیں کہ لوگ خواجہ سرا کو دوست بناتے ہیں، انہیں جنسی تسکین کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اگر وہ ان کی فرمائشیں پوری نہ کریں تو سزا دیتے ہیں۔ کئی خوجہ سرا 'غیرت کے نام پر'، کچھ جنسی تعلق سے انکار پر اور بعض بھتہ نہ دینے پر مار دیے گئے۔

"اب تو صرف گولی ہی سے خوف آتا ہے۔ مار پیٹ، گھونسا تھپڑ، چاقو کے وار وغیرہ کے تو ہم عادی ہو چکے ہیں، لگتا ہے یہی ہمارا مقدر ہے۔ چھوٹے موٹے تشدد پر پولیس کے پاس بھی نہیں جاتے مگر جنسی تشدد اتنا بڑھ گیا ہے کہ ہر رات ہمارا کوئی نہ کوئی ساتھی اس کا نشانہ بنتا ہے۔"

پانچ سالوں میں قتل ڈیڑھ سو اور سزا صرف ایک مجرم کو، وہ بھی پانچ سال قید

نمکین پشاوری کہتی ہیں کہ ریپ کرنے والے آزاد گھومتے ہیں اور مظلوم ڈر ڈر کے زندگی گزارتے ہیں۔ ان کے خیال میں اگر پولیس تین چار ملزمان کو پکڑ کر سزائیں دلائے تو واقعات میں کمی آ سکتی ہے۔

اعداد و شمار خواجہ سراؤں کے اس شکوے کی تصدیق کرتے ہیں۔ خیبر پختونخوا پولیس کے مطابق پانچ برس (2019ء تا 2024ء) کے دوران 150 سے زائد خواجہ سراؤں کو قتل کیا گیا مگر ملزمان میں سے صرف ایک کو پانچ سال قید کی سزا ہوئی۔

فرزانہ ریاض شکوہ کرتی ہیں کہ پولیس ایف آئی آر تو درج کر لیتی ہے اور اکثر ملزمان پکڑے بھی جاتے ہیں لیکن دفعات اتنی کمزور لگائی جاتی ہیں کہ ملزمان چھوٹ جاتے ہیں۔

تاہم ایڈووکیٹ مہوش محبّ کاکاخیل کے خیال میں خواجہ سراؤں کے اکثر کیسز کا اختتام مصالحت پر ہو جاتا ہے۔ "خاندان والے جس خواجہ سرا کو گھر میں قبول نہیں کرتے جب وہ قتل ہو جائے تو وارث بن کر راضی نامہ کر لیتے ہیں۔"

وہ سوات کی خواجہ سرا تتلی کے کیس کا حوالہ دیتی ہیں جنہیں رواں سال پشاور میں قتل کیا گیا تھا۔ خاندان والوں نے لاش لینے سے انکار کر دیا اور جنازے میں بھی نہیں آئے۔

غیر سرکاری تنظیم منزل فاؤنڈیشن کی سربراہ خواجہ سرا آرزو خان نے کفن دفن کا انتظام کرایا لیکن جب مقدمہ چلا تو مقتول کے خاندان نے ملزم عامر کو معاف کر دیا تھا

ایڈووکیٹ مہوش بتاتی کہتی ہیں کہ تتلی کا کیس ان کے گرو خواجہ سرا انمول نے لڑا اور جیت لیا۔ جج نے خاندان کی معافی اور فریقین کی صلح یہ کہتے ہوئے قبول نہیں کی کہ غیرت کے نام پر قتل 'فساد فی الارض' ہے جس میں صلح یا معافی نہیں ہو سکتی۔ عدالت نے ملزم کی ضمانت منسوخ کر دی تاہم وہ کمرہ عدالت

سے فرار ہو گیا اور تا حال دوبارہ گرفتار نہیں ہوا۔

مقتولوں کو دفنانے کے لیے بھی 'بھتہ' دینا پڑتا ہے، مشران بھی ملزمان کا ساتھ دیتے ہیں

ٹرانس کمیونٹی کے لیے خیبر پختونخوا کی دھرتی اتنی تنگ ہو چکی ہے کہ مقتولین کی آخری رسومات بھی مسئلہ بن جاتی ہیں۔ مقامی افراد و مشران ملزمان کا ساتھ دیتے ہیں اور مقتول کو قبر کی جگہ تک نہیں ملتی۔

پچھلے ماہ پشاور میں پریس کانفرنس کے دوران غیر سرکاری تنظیم منزل فاونڈیشن کی سربراہ خواجہ سرا آرزو خان نے بتایا تھا کہ کمیونٹی کو ایک مقتول کی نمازہ جنازہ کے لیے 50 ہزار روپے ادا کرنا پڑے۔

لوک سجاگ سے بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ان کی کمیونٹی کے بیشتر لوگ ناخواندہ ہیں اور انہیں پتہ ہی نہیں ہوتا کہ حملے یا تشدد کی صورت میں کہاں سے مدد لینی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پولیس بھی تعاون نہیں کرتی۔

وہ کہتی ہیں کہ جب تک خواجہ سراؤں کے تحفظ اور روزگار کے لیے قانون سازی، تعلیم و صحت کے مراکز اور تھانوں میں اس کمیونٹی کے نمائندے نہیں ہوں گے ان کی مشکلات کم نہیں ہوں گی۔ حکومت کو کمیونٹی کی فنی تعلیم، گرانٹس، شیلٹر ہوم، کیسز کی پیروی کے لیے سرکاری وکلا کا انتظام کرنا ہوگا۔ ان کے لیے جنازہ گاہ اور قبرستانوں میں بھی حصے مختص کیے جائیں۔

غیر سرکاری تنظیم بلیو ویینز کی عہدیدار قمر نسیم کا ماننا ہے کہ خواجہ سراؤں سے متعلق موجودہ قوانین پر عمل درآمد کے لیے پولیس کی تربیت، محکمہ سوشل ویلفیئر اور نادرا میں ٹرانسجینڈر رز کی رجسٹریشن لازمی ہونی چاہیے۔ قتل یا تشدد کے مجرموں کو سزا ئیں ملنے پر ہی خواجہ سراؤں کے خلاف جرائم میں کمی لائی جا سکتی ہے۔

حکومت نے دعوے تو بہت کیے لیکن عملی اقدامات نہ ہونے کے برابر ہیں

انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والے تیمور کمال سمجھتے ہیں کہ خیبر پختونخوا میں خواجہ سراؤں کے تحفظ کے لیے کوئی قانون سازی نہیں کی گئی۔ حکومت نے دعوے تو بہت کیے لیکن عملی اقدامات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

صوبائی حکومت نے پہلے ٹرانس کمیونٹی کے لیے بجٹ میں کچھ رقم مختص کی لیکن پھر یہ سلسلہ وہیں رک گیا۔ کہا گیا کہ ہسپتالوں میں ان کے لیے وارڈز مختص کر دیے ہیں اور تحفظ کے اقدامات کیے گئے ہیں لیکن عملاً کچھ نہ ہوا۔" حکومت نے انسانی حقوق کو بہت پیچھے دھکیل دیا ہے۔"

تیمور کمال بھی یہ الزام دہراتے ہیں کہ خواجہ سراؤں پر تشدد میں ملوث افراد گرفتار کر لیے جاتے ہیں لیکن کمزور ایف آئی آر اور ناقص تفتیش کی بنا پر ملزمان کو سزا نہیں ملتی۔

ایس پی فقیر آباد ڈویژن پشاور محمد ارشد خان اس الزام کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آئی جی خیبر پختونخوا نے صنفی مساوات کے لیے ایک افسر تعینات کیا ہے جو خواجہ سراؤں کو ہر ممکن تعاون کرتے ہیں۔ فقیر آباد ڈویژن میں رواں سال خواجہ سراؤں پر تشدد کے چار کیسز رجسٹر ہوئے جن میں دس ملزمان نامزد ہیں آٹھ کو گرفتار کیا جا چکا ہے۔

"خواجہ سراؤں کے فوکل پرسن ہمارے ساتھ رابطے میں

ہوتے ہیں جو ہر مسئلہ ڈسکس کرتے ہیں۔ ڈی آر سی (تنازعات حل کرنے والی کونسل) میں بھی ان کی نمائندگی موجود ہے۔"

خواجہ سراؤں کی تعداد بھی متنازع ہے

پاکستان میں خواجہ سراؤں (ٹرانس جینڈرز) کی تعداد متنازع ہے۔ 2017ء کی مردم شماری میں انہیں پہلی بار گنا گیا تو ان کی کل تعداد 21 ہزار 774 درج ہوئی جبکہ ملک کی مجموعی آبادی تقریباً پونے 21 کروڑ تھی۔ سات سال بعد 2023ء میں دوبارہ مردم شماری کی گئی تو ملک کی مجموعی آبادی تو بڑھ کر 24 کروڑ سے زائد ہو گئی لیکن ٹرانس جینڈر افراد کی تعداد کم ہو کر 20 ہزار 331 رہ گئی۔ جو بجائے خود ان اعداد کو مشکوک بناتا ہے۔

خیبر پختونخوا میں بھی ان سات سال میں ٹرانس افراد کی تعداد دو ہزار 325 سے کم ہو کر ایک ہزار 117 ہو گئی۔

تاہم کمیونٹی کے تمام سرکردہ افراد کا ماننا ہے کہ خواجہ سراؤں کی حقیقی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ فرزانہ ریاض کا دعویٰ ہے کہ پانچ ہزار سے زائد ٹرانس جینڈر تو صرف پشاور میں ہیں۔

(بشکریہ لوک سجاگ)

جہد حق پڑھنے والے توجہ کریں

- آپ نے اس شمارہ کا مطالعہ کیا۔

جو خامیاں / کمزوریاں آپ کو نظر آئی ہوں۔ ان کی نشاندہی خط کے ذریعے سے کیجئے۔

- آپ بھی اپنے علاقے میں ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی رپورٹ / اطلاع ہمیں اس رسالہ میں چھپنے والا رپورٹ فارم پُر کر کے بذریعہ ڈاک روانہ کر سکتے ہیں۔ حقائق اچھی طرح سے تصدیق کر کے لکھیں۔

HRCP کارکن متوجہ ہوں

''جہد حق'' کے لیے رپورٹ فارم کے مطابق کوائف پر مبنی رپورٹیں، خبریں، تصاویر اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے متعلق دیگر مواد مہینے کے تیسرے ہفتہ تک پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے مرکزی دفتر میں پہنچ جانا چاہیے تا کہ یہ اگلے شمارے میں شائع کیا جا سکے۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

''ایوان جمہور'' 107 - ٹیپو بلاک،

نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

جہد حق کا تازہ شمارہ اور پچھلے شمارے ویب سائٹ پر موجود ہیں۔ پتہ:

www.hrcp-web.org

وہ قبرستان، جہاں صرف 'کاریوں' کی کہانیاں دفن ہیں

رابعہ بگٹی سارا گل، ڈی ڈبلیو

پاکستان کے صوبہ سندھ میں غیرت کے نام پر قتل ہونے والی لڑکیوں کا ایک گمنام قبرستان ہے، جہاں نہ قبروں پر کتبے نصب کیے جاتے ہیں نہ پھول ڈالنے کوئی رشتے دار آتا ہے۔

اس قبرستان میں چند ہی قبروں کے گرد کچھ اینٹیں رکھی گئی ہیں۔ پاکستان کے صوبہ سندھ کے شہر گھوٹکی سے ایک گھنٹے کی مسافت پر ایک چھوٹا سا گاؤں فتو شاہ واقع ہے۔ گھوٹکی سے فتو شاہ کا یہ سفر عائشہ دھاریجو نے ان گنت بار طے کیا ہے۔ شہر سے یہاں جانے والی سڑک اردگرد کپاس کے کھیتوں کی وجہ سے بہت تنگ ہے۔

عائشہ گزشتہ 15 سالوں سے اس پر تحقیق کر رہی ہے کہ مقامی لوگ ایک خالی سنسان جگہ کو آخر 'بے عزت عورتوں کا قبرستان' کیوں کہتے ہیں۔ دھاریجو نے ڈی ڈبلیو کو بتایا، "ہر قبر ایک عورت کی کہانی کو ظاہر کرتی ہے جسے خاموش کر دیا گیا ہے۔''

دھاریجو بتاتی ہیں کہ غیرت کے نام پر قتل ہونے والا انسان چاہے عورت ہو یا مرد، اس معاشرے میں زندگی تو کیا اسے موت بھی عزت سے نہیں دی جاتی۔ ان کی لاشوں کو نہ نہلایا جاتا ہے اور نہ ہی تدفین کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ کوئی آخری رسومات کا تردد تک نہیں کرتا۔ مقتولین کو گڑھوں میں ڈال دیا جاتا ہے اور جانوروں کو لاشوں سے دور رکھنے کے لیے ان مردہ جسموں کو مٹی سے ڈھانپ دیا جاتا ہے۔ غیرت کے نام پر قتل کر دی جانے والی ان خواتین کی تدفین کی جگہ پر کوئی باقاعدہ قبر ہے اور نہ ہی کوئی نام۔ کچھ 'قبروں' پر زمین میں دھنسی ہوئی ٹوٹی ہوئی اینٹوں کی باقیات موجود ہیں۔ لیکن زیادہ تر پر یہ اینٹیں بھی نہیں رکھی گئیں۔ یہ ملحقہ مرکزی قبرستان سے بالکل مختلف ہے۔

قریبی گاؤں سے تعلق رکھنے والی مقامی سماجی کارکن زرقا شار ان چند لوگوں میں سے ایک ہیں جو اس موضوع پر بات کرنے کو تیار ہیں۔ انہوں نے ڈی ڈبلیو کو بتایا کہ 'کاریوں' کا یہ قبرستان ایک صدی سے زیادہ پرانا ہے۔

انہوں نے ڈی ڈبلیو کو بتایا، "یہ علاقہ اب بھی جاگیرداروں اور زمینداروں کا ہے۔ جو عام آدمی کے روزگار، اس کی اجرت اور ذریعہ معاش کو کنٹرول کرتے ہیں۔''

شار نے مزید کہا کہ اس طرح کے نظام میں مقامی رسم و رواج اکثر ریاستی قانون کو کمزور کر دیتے ہیں اور "غیرت کے نام پر قتل'' جیسے حساس موضوع پر سوال اٹھانا مقامی رہائشیوں کو خطرے میں ڈال سکتا ہے۔

نام نہاد غیرت کے نام پر قتل کی بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مقتولین کے اہل خانہ یا رشتہ داروں کو لگتا ہے کہ مقتول کی وجہ سے معاشرے میں ان کی بدنامی ہوئی ہے یا ان کی وجہ سے انہیں شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

پاکستان کے کچھ دیہی علاقوں میں خواتین اور مردوں کو اپنے شریک حیات کا انتخاب کرنے، مخالف جنس کے کسی فرد سے بات کرنے، اپنی ذات یا مذہب سے باہر شادی کرنے یا سماجی اور ثقافتی طور پر کوئی بھی ایسا عمل کرنے جسے وہ غیر اخلاقی سمجھتے ہوں، اس طرح کے سنگین حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے اعداد و شمار کے مطابق 2024 میں پاکستان بھر میں کم از کم 405 افراد کو "غیرت کے نام پر قتل'' کیا گیا، جن میں سندھ اور پنجاب میں سب سے زیادہ تعداد ہے۔ سرکاری اعداد و شمار سالہا سال سے کم و بیش ایک جیسے ہی رہے ہیں تاہم محققین نے خبردار کیا ہے کہ اس طرح کے جرائم اکثر کم رپورٹ کیے جاتے ہیں اور حقیقی اعداد و شمار اس سے کہیں زیادہ ہونے کا امکان ہے۔

دھاریجو نے کہا کہ پاکستان میں غیرت کے نام پر قتل کا "روایت'' سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی ایک مصمم حقیقت ہے کہ یہ قتل طویل عرصے سے جاری ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا، 'خاندانوں اور قبائلی جرگوں کے درمیان مذاکرات میں خواتین کی لاشیں کرنسی بن جاتی ہیں۔ جن میں قتل اکثر جائیداد کے تنازعات کو چھپا دیتا ہے یا خون کے بدلے خون کے نظام کو فعال کرتا ہے۔''

'اس نے میرے چلنے کی صلاحیت چھین لی'

ان خواتین میں سے صوبیہ بتول شاہ بھی ہیں۔ جب ان کی عمر 22 سال تھی تو ایک روز ان کے والد چھ دیگر مرد رشتہ داروں سمیت ان کے گھر میں داخل ہوئے۔ باپ نے اپنی بیٹی پر شوہر سے طلاق مانگ کر خاندان کی عزت خاک میں ملانے کا الزام لگایا۔ ان تمام مردوں نے صوبیہ پر حملہ کیا اور ایک نے کلہاڑی سے ان کی ٹانگیں کاٹ ڈالیں۔

شاہ نے کہا، "میں وہ دن کبھی نہیں بھولوں گی۔ جب وہ مجھے مارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے معذور کر دیا اور یہی میرا سب سے بڑا درد ہے۔ انہوں نے میری چلنے کی طاقت چھین لی۔''

شاہ نے ڈی ڈبلیو کو بتایا کہ اس کے اب تک چار آپریشن ہو چکے ہیں۔ اس کی ٹانگیں پلاسٹرز میں لپٹی ہیں اور وہ اب بھی بیساکھیوں کا استعمال کرتی ہیں۔ تاہم وہ اب بھی اپنے کیس کی پیروی کر رہی ہیں۔ جب وہ دوسری منزل پر عدالتی سماعت سننے کی غرض سے جاتی ہیں تو ان کا بھائی شوکت علی شاہ انہیں اپنے کندھوں پر اٹھا کر اوپری منزل تک لے جاتا ہے۔''

شاہ کے والد جیل میں ہیں تاہم وہ دیگر ملزمان کے خلاف اب بھی قانون کی جنگ لڑ رہی ہیں۔

'وہ مجھ سے زبردستی کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہا تھا'

صرف 12 سال کی عمر میں حلیمہ بھٹو کی شادی ہوگئی۔ شادی کے فوری بعد اس کے شوہر شکیل احمد نے اس سے جائیداد کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا جو اسے اپنے مرحوم والد سے وراثت میں ملی تھی۔

کئی بار انکار کے بعد اس نے حلیمہ کو گھوٹکی میں ان کے میکے بھیج دیا، جہاں وہ اگلے اٹھارہ سال تک مقیم رہیں۔

احمد دوبارہ سامنے آیا، صلح کرنے کے لیے نہیں، بلکہ ایک ایسے الزام کے ساتھ جو گھوٹکی کے جاگیردارانہ نظام میں موت کے وارنٹ کے طور پر کام کرتا ہے۔ اس نے یہ الزام عائد کیا کہ حلیمہ کا اس کے بہنوئی کے ساتھ ناجائز رشتہ ہے۔

حلیمہ نے ڈی ڈبلیو کو بتایا، "یہ الزام بالکل غلط تھا۔ وہ دوبارہ میری جائیداد چاہتا تھا اور اسے حاصل کرنے کے لیے اس نے دوسرا راستہ تلاش کر لیا تھا۔'' حلیمہ نے کہا کہ اپنی جان بچانے کا واحد راستہ گھوٹکی چھوڑ کر اسلام آباد جانا تھا۔

پندرہ مہینوں سے زیادہ عرصے تک حلیمہ پاکستانی دارالحکومت کے پریس کلب کے باہر احتجاجاً بیٹھی رہیں۔ انہوں نے بھوک ہڑتال بھی کی اور حکومت پر ملک کے جاگیردارانہ نظام کے خلاف بے عملی کا الزام لگاتی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنا معاملہ عوامی کٹہرے میں لے کر آنا چاہتی تھی تاکہ مجھے خاموشی سے موت کے گھاٹ نہ اتار دیا جائے۔ حلیمہ کی آواز پاکستان کے سپریم کورٹ تک پہنچی، جہاں انہوں نے 2011 میں ایک تاریخی فیصلہ جیتا۔ عدالت نے ان کی طلاق منظور کی اور ان کے والدین کی چھوڑی ہوئی جائیداد بھی ان کے حوالے کرنے کے احکامات جاری کر دیے۔

انہوں نے ڈی ڈبلیو سے بات کرتے ہوئے کہا، "یہ صرف میری لڑائی نہیں تھی، یہ ہر اس عورت کے لیے لڑائی تھی جو ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرتی ہے۔''

'غیرت کے نام پر قتل' کے کیسز کا جلد خاتمہ ہوگا، سندھ پولیس

گھوٹکی کے ضلعی پولیس ہیڈ کوارٹر میں ڈی ڈبلیو نے سینیئر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس (ایس ایس پی) محمد انور کھیتر ان سے اس موضوع پر کھل کر بات کی۔ انہوں نے کہا "یہ عمل کسی صورت قابل قبول نہیں، یہ قابل نفرت ہے اور اسے معاشرے سے ختم کر دینا چاہیے۔'' ان کے مطابق تاہم اس نظام کے بدلنے میں دہائیاں لگ سکتی ہیں۔

سندھ کے نوشہرو فیروز ضلع کے ایس ایس پی میر روحل کھوسو نے ڈی ڈبلیو کو بتایا کہ تعلیم اور سماجی اقتصادی ترقی جلد تبدیلی لانے میں مددگار ہوگی۔ انہوں نے کہا، "جب ایک خاتون تعلیم یافتہ اور معاشی طور پر خودمختار ہوتی ہے، تو اسے اپنے حقوق کا علم ہوتا ہے۔''

عائشہ دھاریجو اس رپورٹ کی تیاری کے دوران مسلسل ڈی ڈبلیو کی ٹیم کے ساتھ رہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ اپنا کام جاری رکھیں گی تاکہ خواتین کے بنیادی حقوق فتو شاہ جیسے قبرستانوں یا صوبہ سندھ کے اسی حصے میں موجود کم از کم تین ایسے دیگر قبرستانوں میں دفن نہ کر دیے جائیں۔

(بشکریہ ڈی ڈبلیو ڈی)

ذہنی صحت کے مسائل کا حل قابلِ عمل تجاویز

اسرارالدین اسرار

گلگت بلتستان میں ذہنی صحت کا مسئلہ اب ایک سنگین سماجی بحران کی شکل اختیار کرتا جارہا ہے، مگر افسوس کہ اسے ابھی تک حکومتی ترجیحات میں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کا یہ حقیقی طور پر مستحق ہے۔ چیف سیکریٹری گلگت بلتستان کی زیرِ صدارت قائم مینٹل ہیلتھ اسٹیئرنگ کمیٹی کو تین سال مکمل ہو چکے ہیں، لیکن اس طویل عرصے میں ذہنی صحت کے حوالے سے کوئی نمایاں پیشرفت دیکھنے میں نہیں آئی۔ کمیٹی کا حالیہ پندرواں اجلاس یقیناً ایک مثبت قدم ہے، مگر ایسے اجلاس اگر عملی بنیادوں پر نہ ہوں تو یہ کاغذی کارروائی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

ذہنی صحت کے بگڑتے مسائل کا سب سے بڑا عامل یہی حکومتی عدم توجہی ہے۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے مطابق پاکستان میں ہر دوسرا یا تیسرا شخص ذہنی صحت کی خدمات کا محتاج ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ خدمات ملک کے دیگر صوبوں کی طرح گلگت بلتستان میں بھی تقریباً ناپید ہیں۔ یہاں کے بچے، نوجوان، طلبہ، خواتین، بزرگ، افراد باہم معذوری اور دوردراز علاقوں میں رہنے والے شہری نفسیاتی دباؤ، اضطراب، ڈپریشن اور سماجی تنہائی جیسے مسائل میں اضافہ محسوس کررہے ہیں۔ اس بدتر صورتحال کی ایک وجہ وہ سرکاری منصوبہ بھی ہے جسے دوسال قبل منظور کیا گیا تھا، مگر جس پر آج تک عملدرآمد نہ ہوسکا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ذہنی صحت کا بحران کسی ایک وقتی منصوبے سے حل نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے لیے مستقل ڈھانچہ، تربیت یافتہ عملہ، بجٹ اور طویل المدتی حکمت عملی کی ضرورت ہوتی ہے۔

ذہنی صحت کی ابتری ہمارے معاشرے میں کئی نئے مسائل کو جنم دے رہی ہے۔ جیسے گھریلو جھگڑے، صنفی تشدد، منفی رویوں میں اضافہ، منشیات کا بڑھتا رجحان، نوجوانوں کا بے سمتی کا شکار ہونا، اور سب سے بڑھ کر خودکشی کے بڑھتے واقعات اور دیگر سماجی مسائل، یہ سب اسی غفلت کے نتائج ہیں۔ گلگت بلتستان جیسے حساس خطے میں جہاں معاشی مواقع محدود، سماجی دباؤ زیادہ اور رسائی کے مسائل گہرے ہیں، وہاں ذہنی صحت کے لیے مضبوط نظام کی تشکیل وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

کچھ دہائیوں سے جاری موسمیاتی تبدیلیوں کے نتیجے میں ہونے والی تباہی اور نقل مکانی نے ذہنی صحت کے مسائل میں کئی گنا اضافہ کردیا ہے۔

المیہ یہ بھی ہے کہ خطے میں کام کرنے والی سول سوسائٹی تنظیمیں اگرچہ محدود وسائل میں اہم کام کررہی ہیں، مگر پالیسی سازی کے فورمز پر ان کی آواز شاذ و نادر ہی سنی جاتی ہے۔ اسٹیئرنگ کمیٹی کو چاہیے کہ وہ نہ صرف ان اداروں کو سنے بلکہ ان کی تجرباتی معلومات کو صوبائی حکمت عملی کا حصہ بنائے۔ ذہنی صحت کے بحران کے حل کے لیے حکومت کو فوری طور پر ایک مضبوط قانون سازی کی طرف جانا ہوگا اور گلگت بلتستان میں ایک فعال مینٹل ہیلتھ ایکٹ نافذ کرنا ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر ضلع میں مینٹل ہیلتھ یونٹس کا قیام، ماہرینِ نفسیات اور پروفیشنلز کے علاوہ کمیونٹی ورکرز یا کونسلرز کی تعیناتی، سکولوں اور یونیورسٹیوں میں کونسلنگ پروگراموں کا آغاز اور کمیونٹی سطح پر بیداری مہمات ناگزیر ہیں۔

اس کے علاوہ ہنگامی بنیادوں پر ایک 24/7 مینٹل ہیلتھ ہیلپ لائن کا قیام بھی ضروری ہے تاکہ ذہنی دباؤ، گھریلو تشدد یا خودکشی کے خطرے سے دوچار افراد کو فوری سہارا مل سکے۔ جنرل فزیشنز اور پیرامیڈیکل اسٹاف کو عالمی معیار کے مطابق WHOmhGAP پروگرام کے تحت تربیت دینا بھی ایک اہم قدم ہوگا۔ خطے میں ذہنی صحت کے حقیقی اعداد و شمار کا کوئی منظم نظام موجود نہیں، اس لیے ہر ضلع میں ڈیٹا اکٹھا کرنے کا مستقل میکنزم قائم کرنا چاہیے اور سالانہ بنیادوں پر ذہنی صحت کی صورتحال پر رپورٹ شائع کی جانی چاہیے۔

دنیا بھر میں ذہنی صحت کو انسانی ترقی کا بنیادی ستون سمجھا جاتا ہے، اور یہ شہریوں کا بنیادی انسانی حق بھی ہے کہ ان کو جسمانی، ذہنی اور تولیدی صحت کی آگاہی اور سہولیات بہم پہنچائی جائیں۔ مگر گلگت بلتستان میں اس حوالے سے حکومتی بے حسی وقت گزرنے کے ساتھ بحران کو مزید گہرا کررہی ہے۔ یہ وقت تقاضا کرتا ہے کہ حکومت جسمانی صحت کی طرح ذہنی صحت کو بھی اپنی اولین ترجیح بنائے، پائیدار حکمت عملی ترتیب دے، اور اسٹیئرنگ کمیٹی کو فعال اور بااختیار بنائے۔ اگر اب بھی سنجیدہ اقدامات نہ اٹھائے گئے تو یہ بحران معاشرتی، معاشی اور انسانی سطح پر ایسے نقصانات کو جنم دے گا جن کی تلافی مستقبل میں ممکن نہیں ہوگی۔

ماضی کی تلخی کا سفر

نعمان یاور

انسانی نفسیات کے متعدد مطالعات اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ زندگی کا موثر تجربہ ''حال'' میں جینے سے مشروط ہے۔ نفسیاتی ماہرین کے مطابق جب انسان غیر ضروری طور پر ماضی کی طرف بار بار رجوع کرتا ہے تو اس کے ذہنی و جذباتی توازن پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ماضی کی تلخ یادیں، ناکام تجربات اور نامکمل خواہشات دماغ میں مخصوص جذباتی مراکز کو بار بار فعال کرتی ہیں، جس کے نتیجے میں اداسی، بے اطمینانی اور اضطراب میں اضافہ ہوتا ہے۔

تحقیقات یہ بھی ظاہر کرتی ہیں کہ انسان گزرے ہوئے واقعات کو محض یاد نہیں کرتا بلکہ ان کی نئی تشریحات اور تاویلات بھی تشکیل دیتا رہتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ تشریحات اکثر زیادہ بوجھل اور جذباتی رنگ اختیار کرلیتی ہیں۔ یوں ماضی کی یادیں، جنہیں ''نفسیاتی فائلیں'' کہا جاسکتا ہے، بتدریج دباؤ اور ذہنی تھکن کا باعث بنتی ہیں۔ بعض اوقات یہ یادیں اتنی بھاری ہو جاتی ہیں کہ فرد موجودہ لمحے کی کارکردگی اور کیفیت دونوں میں گھر جاتا ہے۔ اسی طرح مستقبل کے بارے میں غیر حقیقت پسندانہ توقعات اور غیر ضروری خدشات بھی انسان کی ذہنی حالت کو متاثر کرتے ہیں۔ ''اگر میں ناکام ہوگیا؟''، ''کل کیا ہوگا؟''، یا ''میں اس صورتحال کا سامنا کیسے کروں گا؟'' جیسے سوالات، انسانی ذہن میں ایک فرضی اور پیچیدہ مستقبل کی تعمیر کرتے ہیں۔ اس تعمیر شدہ مستقبل سے پیدا ہونے والا خوف اور بے یقینی فرد کے موجودہ لمحے کا سکون چھین لیتے ہیں۔ بالعموم فرد ماضی کے زخموں کو کریدنے یا مستقبل کی تشویش میں مبتلا ہونے کے عمل سے خود کو روک نہیں سکتا۔ یہ رویہ انسانی ذہن کے اُن دفاعی یا بقا پر مبنی میکانزم کا حصہ ہے جو ہمیں خطرات سے آگاہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر جب یہ میکانزم ضرورت سے زیادہ فعال ہو جائیں تو معمول کی زندگی متاثر ہونے لگتی ہے۔ نتیجتاً فرد اپنے مسائل کا ذمہ دار والدین، بہن بھائی، دوستوں یا سماجی و پیشہ ورانہ تعلقات کو ٹھہرانا شروع کردیتا ہے۔

تحقیقی زاویے سے دیکھا جائے تو یہ ساری صورتِ حال ماضی سے جذباتی وابستگی اور مستقبل سے غیر حقیقی توقعات کا مجموعہ ہے۔ ماہرین ذہنی صحت اس امر پر مسلسل زور دیتے ہیں کہ فرد کو اپنے ذہن و جذبات کو حال میں مرکوز رکھنے کی تربیت دینی چاہیے۔ یہ نقطہ نظر نہ صرف ذہنی سکون فراہم کرتا ہے بلکہ زندگی کے عملی فیصلوں میں بھی وضاحت پیدا کرتا ہے۔

اگر انسان شعوری طور پر خود کو ماضی کے بوجھ اور مستقبل کے فریب سے آزاد کرنا نہ سیکھے تو اس کی شخصیت تلخی کے ایک مسلسل سفر میں پھنسی رہتی ہے ایسا سفر جس کا نہ کوئی موثر اختتام ہوتا ہے اور نہ کوئی حقیقی مقصد۔ (بشکریہ ہم سب)

آن لائن ہراسانی: دنیا کی 1.4 ارب خواتین قانونی تحفظ سے محروم، یواین ویمن

ڈیجیٹل دنیا باہمی رابطوں میں بہتری اور لوگوں کو بااختیار بنانے کا وعدہ تھا لیکن لاکھوں خواتین اور لڑکیوں کے لیے یہ ایک ایسی جگہ بنتی جارہی ہے جو تشدد اور بدسلوکی سے عبارت ہے۔

ڈیجیٹل تشدد خطرناک رفتار سے پھیل رہا ہے جسے موثر قوانین و احتساب کی کمی اور مصنوعی ذہانت سے ہوا مل رہی ہے۔ آن لائن ہراسانی اور تعاقب سے لے کر بدنامی، رضامندی کے بغیر تصاویر اور ویڈیو شیئر کرنے، ڈیپ فیک اور غلط معلومات کے پھیلاؤ تک کئی طرح کا یہ تشدد اب انٹرنیٹ کے ہر گوشے میں سرایت کر چکا ہے اور اس کے ذریعے خواتین اور لڑکیوں کو خاموش کرنے، بدنام کرنے اور ڈرانے کا کام لیا جارہا ہے۔ عالمی بینک کے مطابق، 40 فیصد سے بھی کم ممالک میں خواتین کو آن لائن ہراسانی یا تعاقب سے تحفظ دینے کے لیے قوانین موجود ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی 44 فیصد خواتین اور لڑکیاں یعنی 1.8 ارب افراد قانونی تحفظ تک رسائی سے محروم ہیں۔

کمزور قانونی تحفظ

کاروبار یا سیاست میں قیادت کے عہدوں پر فائز خواتین تواتر سے ڈیپ فیک، منظم ہراسانی اور صنفی بنیاد پر پھیلائی جانے والی غلط معلومات کا نشانہ بنتی ہیں جن کا مقصد انہیں اپنی جگہ سے ہٹانا یا عوامی زندگی سے خارج کرنا ہوتا ہے۔ یواین ویمن کے مطابق، دنیا بھر میں ایک چوتھائی خاتون صحافیوں نے آن لائن جسمانی تشدد حتیٰ کہ قتل کی دھمکیاں موصول ہونے کی اطلاع دی ہے۔

ادارے کی ایگزیکٹو ڈائریکٹر سیما بحوث کا کہنا ہے کہ جو کچھ آن لائن شروع ہوتا ہے وہ وہیں تک محدود نہیں رہتا بلکہ ڈیجیٹل بدسلوکی حقیقی زندگی تک پھیل جاتی ہے، خوف پیدا کرتی ہے، آوازوں کو خاموش کراتی اور بدترین صورتوں میں جسمانی تشدد اور خواتین کے قتل تک جا پہنچتی ہے۔

انہوں نے کہا ہے کہ قوانین کو ٹیکنالوجی کے مطابق ترقی کرنی چاہیے تاکہ انصاف خواتین کو آن لائن اور آف لائن دونوں جگہ تحفظ فراہم کرے۔ کمزور قانونی تحفظ کے باعث لاکھوں خواتین اور لڑکیاں غیر محفوظ رہ جاتی ہیں جبکہ مجرم بلاخوف وخطر کام کرتے ہیں جبکہ یہ ناقابل قبول ہے۔

یواین ویمن اپنی 16 روزہ مہم کے ذریعے ایک ایسی دنیا تخلیق کرنے کی اپیل کررہی ہے جہاں ٹیکنالوجی نقصان نہیں بلکہ برابری کو فروغ دے۔

مصنوعی ذہانت اور بدسلوکی

آن لائن بدسلوکی اور تشدد کے بہت کم واقعات کی اطلاعات سامنے آتی ہیں۔ عدالتی نظام اس حوالے سے تیار نہیں اور ٹیکنالوجی پلیٹ فارمز پر احتساب نہ ہونے کے برابر ہے۔ مصنوعی ذہانت پر مبنی

آن لائن بدسلوکی سے متاثرین کو ذہنی و جسمانی دونوں طرح کے نقصانات کا سامنا رہتا ہے

بدسلوکی کے بڑھتے ہوئے رجحان نے سرحدوں اور پلیٹ فارمز کے پار مجرموں کی بے خوفی میں مزید اضافہ کردیا ہے۔

تاہم اس تمام صورتحال کے باوجود بہتری کی جانب پیش رفت بھی جاری ہے۔ قوانین کو ٹیکنالوجی میں آنے والی تیز رفتار تبدیلی کا مقابلہ کرنے کے قابل بنایا جارہا ہے۔ برطانیہ اور آسٹریلیا کے 'آن لائن سیفٹی ایکٹ' سے لے کر میکسیکو کے 'اولیمپیا ایکٹ' اور یورپی یونین کے 'ڈیجیٹل سیفٹی ایکٹ' تک بہت سے نئے اصلاحاتی اقدامات سامنے آرہے ہیں۔

رواں سال تک 117 ممالک نے آن لائن تشدد سے نمٹنے کی کوششوں پر رپورٹ دی، تاہم عالمگیر نوعیت کے اس مسئلے کے مقابلے میں یہ کوششیں اب بھی منتشر ہیں۔

اقوام متحدہ کی سفارشات

یواین ویمن نے اس مسئلے پر قابو کے لیے درج ذیل اقدامات کی اپیل کی ہے:

- ڈیجیٹل پلیٹ فارمز اور مصنوعی ذہانت کے آلات کو حفاظتی اور اخلاقی معیار کے مطابق بنانے کے لیے عالمی تعاون
- آن لائن تشدد سے متاثرہ خواتین کی معاونت کے لیے حقوق نسواں کی تنظیموں کی مالی امداد
- بہتر قوانین اور ان کے نفاذ کے ذریعے مجرموں کا احتساب
- ٹیکنالوجی کمپنیوں میں خواتین کی تعداد بڑھا کر آن لائن ماحول کو محفوظ بنانے، نقصان دہ مواد کو ہٹانے اور شکایات پر موثر کارروائی کے لیے اقدامات
- رویوں میں تبدیلی اور تحفظ کے لیے سرمایہ کاری، جس میں خواتین اور لڑکیوں کے لیے ڈیجیٹل خواندگی، آن لائن حفاظت کی تربیت اور زہریلی آن لائن ثقافت کا مقابلہ کرنے کے پروگرام شامل ہوں۔

خواتین کے خلاف صنفی بنیاد پر تشدد کے خاتمے کی 16 روزہ مہم عالمی سطح پر ہنگامی اقدامات کا مطالبہ کرتی ہے تاکہ قانونی خلا کو پر کیا جائے، مجرموں کو جوابدہ ٹھہرایا جائے اور ٹیکنالوجی پلیٹ فارمز کو ذمہ دار بنایا جاسکے۔ (بشکریہ یواین خبرنامہ)

معذوری کا شکار افراد کے حقوق کے عالمی دن

معذوری کا شکار افراد کے حقوق کے عالمی دن 2025 کے موقع پر، پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق ایک بار پھر واضح کرتا ہے کہ معذوری سے متعلق حقوق انسانی حقوق ہیں، جو ناقابلِ تقسیم، غیر مشروط اور وقار پر مبنی ہیں۔

ہم یقین رکھتے ہیں:

☆ خیرات کی بجائے حقیقی شمولیت پر

☆ ہمدردی کی بجائے مساوی مواقع پر

☆ اور اس اصول پر کہ رسائی جمہوریت کی بنیادی شرط ہے

ڈیجیٹل پلیٹ فارمز سے لے کر عوامی ڈھانچے تک، ہم محفوظ شہری شمولیت، رکاوٹوں سے پاک ماحول اور امتیاز سے تحفظ کے حامی ہیں۔

سماجی سمجھ بوجھ اور خاندان کا کردار۔ انٹرسیکس اور ٹرانس جینڈر افراد کا فرق

(تحریر: ڈاکٹر ثناء یاسر۔ انٹرسیکس ایجوکیٹر۔ ٹرانس جینڈر ہیلتھ پریکٹیشنر)

پاکستانی معاشرے میں انٹرسیکس اور ٹرانس جینڈر افراد کے بارے میں غلط فہمیاں عام ہیں۔ اکثر لوگ ان دونوں اصطلاحات کو ایک جیسا سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ یہ حقیقت میں دو مختلف پہلو ہیں۔ ان کا فرق جاننا انسانی احترام، اجتماعی آگاہی اور ایک شائستہ معاشرہ بنانے کے لیے بہت اہم ہے۔

انٹرسیکس افراد وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے جنسی خصائص پیدائش کے وقت یا بعد میں بچپن، نوعمری یا نوجوانی میں سامنے آتے ہیں۔ یہ کروموسومز، ہارمونز یا جسمانی ساخت میں قدرتی فرق کی وجہ سے ہوتا ہے۔ چونکہ انٹرسیکس حالت ایک واضح طبی حقیقت ہے، اس لیے زیادہ تر مذہبی علما اور خاندان اسے قبول کرتے ہیں اور اسے فطری سمجھتے ہیں۔ سماجی رویوں میں بھی انٹرسیکس افراد کو نسبتاً کم مخالفت کا سامنا ہوتا ہے۔

ٹرانس جینڈر افراد کا معاملہ جسمانی فرق سے زیادہ ذہنی اور نفسیاتی شناخت سے تعلق رکھتا ہے۔ انسان کا دماغ، جو انسانی جسم کا سب سے اہم اور فیصلہ کن حصہ ہے، یہ طے کرتا ہے کہ وہ خود کو کس صنف کے طور پر پہچانتا ہے۔ اگر ایک جسمانی انٹرسیکس کیفیت کو قبول کیا جاتا ہے تو ذہنی شناخت کو کیوں چیلنج کیا جاتا ہے؟ شاید اس کی وجہ ذہنی صحت اور صنفی شناخت کے بارے میں آگاہی کی کمی ہے۔ جب کسی شخص کی دماغی شناخت پیدائشی جسم سے مختلف ہو تو اسے ٹرانس جینڈر کہا جاتا ہے۔ یہ ایک طبعی، ذہنی اور سماجی حقیقت ہے جسے سائنسی سطح پر بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ اسے سمجھنے کے لیے ذہن اور احساسات کو اہمیت دینا پڑتی ہے، اس لیے معاشرے میں اس پر زیادہ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ بہت سے مذہبی علما نے بھی اس موضوع پر طبی ماہرین کے ساتھ مشترکہ رہنمائی فراہم نہیں کی، جس کے باعث سوشل میڈیا مہمات، غلط معلومات اور نفرت انگیز بیانیے ٹرانس جینڈر افراد کو نشانہ بناتے رہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک انٹرسیکس شخص ٹرانس جینڈر بھی ہوسکتا ہے۔ اگر انٹرسیکس فرد اپنی دماغی شناخت کو قبول کرتا ہے جو پیدائشی ساخت سے مختلف ہو، تو وہ دونوں طرح کی پیچیدگیوں سے گزرتا ہے۔

خاندان کا کردار بھی انتہائی اہم ہے۔ انٹرسیکس بچوں کو اکثر خاندان طبی معاملہ سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں، لیکن ٹرانس جینڈر افراد کو اپنے گھروں ہی میں انکار، مخالفت اور نفرت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انہیں گناہ یا غیر فطری سمجھا جاتا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی شناخت دماغ کی سطح پر طے ہوتی ہے، اور اسے مسترد کرنا جذباتی، نفسیاتی اور سماجی نقصان کا باعث بنتا ہے۔

اسی لیے ضروری ہے کہ جیسے ہم جسمانی حقیقت کو سمجھ کر انٹرسیکس افراد کا احترام کرتے ہیں، ویسے ہی ذہنی حقیقت کو سمجھ کر ٹرانس جینڈر افراد کی شناخت کو بھی عزت دیں۔ ان دونوں اصطلاحات کو ایک دوسرے کی جگہ استعمال کرنا درست نہیں، مگر دونوں کو سمجھنا اور قبول کرنا ایک انصاف پسند اور انسانی معاشرے کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

ماہل بلوچ کا مزاحمتی آرٹ: پیاس کی شہزادی کو سچ کی سزا

ڈاکٹر اصغر دشتی

مشیل فوکو کے مطابق جدید ریاستیں اور ریاستی ادارے طاقت کا استعمال صرف تشدد یا جبر کے ذریعے نہیں کرتے بلکہ ڈسکورس کو کنٹرول کر کے بھی استعمال کرتے ہیں۔ یعنی یہ طے کرنا کہ کون سا سوال اٹھایا جا سکتا ہے، کون سا نہیں۔ کون سا مسئلہ جائز گفتگو ہے اور کون سا خطرہ۔ اسی نظریے کی روشنی میں بلوچستان یونیورسٹی میں فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ کی طالبہ ماہل بلوچ کے تخلیقی ارٹ کی نمائش ایک واضح مثال ہے۔ ماہل بلوچ بلوچستان کے ساحلی علاقوں میں پانی کی کمی اور لوگوں کی محرومی کو آرٹ کے ذریعے دکھا رہی تھیں۔ ایک بالکل عام اور اہم سماجی مسئلہ۔ مگر نمائش کے دوران یونیورسٹی انتظامیہ نے اچانک اسے 'سیکیورٹی تھریٹ' کہہ کر بند کروا دیا۔ عوامی مسئلے کو اچانک سیکیورٹائز کرنا، تخلیقی اظہار کو خطرہ بنا کر پیش کرنا اور آرٹسٹک بیانیے کو خاموش کرنا یہ سب وہ طریقے ہیں جنہیں فوکو طاقت کے غیر مرئی ہتھیار کہتا ہے۔

اس واقعے میں بھی طاقت کا استعمال براہِ راست تشدد کے بجائے گفتگو، اظہار، آرٹ اور علامتوں پر کنٹرول کر کے کیا گیا جو یہ واضح کرتا ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے کس طرح مقامی مسائل کو اجاگر کرنے والے بیانیوں کو دبا کر ایک مخصوص خاموشی نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ واقعہ واضح کرتا ہے کہ اکیڈمک فریڈم کس طرح ریاستی سیکیورٹی ڈسکورس کے سامنے کمزور پڑ جاتا ہے۔ یونیورسٹی وہ جگہ ہوتی ہے جہاں طلبہ کو جبر، محرومی، سماجی انصاف کے حصول اور عوامی مسائل پر تنقیدی سوچ پیدا کرنے کے لیے آزادی دی جاتی ہے لیکن یہاں علم کی آزادی کو خطرہ سمجھ کر دبانے کی کوشش کی گئی۔ یونیورسٹیاں سچ کی تلاش کی جگہ ہوتی ہیں اور وہ سیاسی دباؤ سے آزاد ہونی چاہئیں۔ اسٹوڈنٹس کو سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل پر اظہار کی مکمل آزادی ہونی چاہیے۔

لیکن ریاستی طاقت ہمیشہ اُن بیانیوں پر کنٹرول رکھنا چاہتی ہے جو اس کی حکمرانی کو چیلنج کرتے ہوں۔ پانی کی محرومی جیسے بنیادی انسانی مسئلے کو آرٹ کے ذریعے نمایاں کرنا پاور سینٹرز کے لیے ناقابلِ قبول علم (Uncomfortable and Unacceptable Knowledge) بن جاتا ہے اس لیے اسے فوراً بند کیا گیا۔ ماہل بلوچ نے آرٹ کے ذریعے عوام کے اجتماعی دکھ کو بیان کیا۔ یہ آرٹ صرف جمالیات نہیں بلکہ ایک سیاسی اور مزاحمتی عمل بھی ہے اور بلوچستان یونیورسٹی کا ردِعمل اس بات کا اعتراف ہے کہ آرٹ طاقتور ہوتا ہے۔

ماہل بلوچ نے مکران کے ساحلی باشندوں کی پانی سے محرومی کو ایک علامتی احتجاج کے طور پر اپنے آرٹ ورک میں جگہ دی اور اسے 'Princess of Thirst' (پیاس کی شہزادی) کا عنوان دیا۔ ماہل بلوچ کا یہ کام ہنگول نیشنل پارک کی پہاڑیوں میں واقع مشہور قدرتی مجسمے Princess of Hope (امید کی شہزادی) کے تناظر میں ایک تخلیقی، جمالیاتی، احتجاجی اور مزاحمتی ردِعمل ہے۔ پرنسس آف ہوپ اپنی منفرد اہمیت کے باعث بلوچستان کی پہچان سمجھی جاتی ہے اور ماہل نے اسی علامت کو الٹاتے ہوئے اسے امید نہیں بلکہ پیاس کی اذیت سے جوڑ کر مقامی آبادی کی محرومی کو فن کے ذریعے طاقتور انداز میں سامنے لانے کی کوشش کی۔ یوں ان کا آرٹ ورک نہ صرف ایک تخلیقی اظہار ہے بلکہ ساحلی آبادی کے حقیقی مسائل کا علامتی احتجاج بھی ہے۔ یہ پورا معاملہ آخر میں ایک بنیادی سوال چھوڑ جاتا ہے کہ اگر ایک طالبہ کا آرٹ بھی سیکیورٹی کے نام پر خاموش کرایا جا سکتا ہے تو پھر ہمارے تعلیمی اداروں میں علم، آزادی اظہار اور تخلیقی و تنقیدی سوچ کا مستقبل کیا رہ جاتا ہے؟ ماہل بلوچ کی نمائش کا اچانک بند ہونا صرف نمائش کا اختتام نہیں تھا بلکہ اس نے یہ حقیقت بھی بے نقاب کر دی کہ طاقت کس طرح فن، سوال، علامت اور آواز سے خوف کھاتی ہے۔

غذائی عدم توازن: پکاتی عورت ہے، مگر کھاتا کون ہے؟

فاروق اعظم

طاقت کا کھیل صرف ایوان ہائے اقتدار یا دفتروں کی میزوں تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ کھانے کے دسترخوان پر بھی جاری رہتا ہے۔ محنت عورت کرتی ہے مگر مرد کی مجموعی حکمرانی طے کرتی ہے کہ کون، کب، کتنا کھائے گا۔

غذا کی تقسیم بھی ایک صنفی مسئلہ ہے اور کچن پالیٹکس میں مرد کیوں جیت جاتا ہے؟

ملتان کے قریب ایک گاؤں میں بلقیس روزانہ منہ اندھیرے اٹھ کر ناشتہ تیار کرنے لگتی ہیں۔ پہلے شوہر اور پھر بچے اپنی پسند کے مطابق پراٹھے، مکھن، دہی اور انڈے کھاتے ہیں۔ جب تک بلقیس کی باری آتی ہے، چائے کا رنگ سیاہ اور پراٹھے کے ٹکڑوں پر گھی جم چکا ہوتا ہے۔

بلقیس لاپرواہ نہیں ہیں، بس ایک معمول ہے جو لاکھوں دیگر خواتین کی طرح انہیں بھی اپنی والدہ سے وراثت میں ملا ہے: سب سے پہلے اٹھنا، سب سے آخر میں سونا، دن کا بیشتر وقت کچن میں گزارنا اور ہمیشہ باقی بچ جانے والے کھانے پر قناعت کرنا۔

کب کیا پکے گا، اس کا فیصلہ بلقیس کے بچے اور شوہر کرتے ہیں۔ کون کتنا اور کب کھائے گا، اس کا فیصلہ سماجی روایت قدیم زمانوں سے کر چکی ہیں۔

مگر گھریلو عورت خود کھانا سب سے آخر میں کیوں کھاتی ہے؟ کیا دوسرے گھر والوں کے بچے ہوئے ٹکڑوں پر قناعت کرنا اس کا اپنا انتخاب ہے؟ کیا اس کے اثرات صرف اس کی سماجی حیثیت تک محدود رہتے ہیں، یا پھر جسم بھی اس ناانصافی کا بوجھ اٹھاتا ہے؟

عورت کا جسم: غذائی عدم توازن کا پہلا نشانہ

غذائی امور کی ماہر اور پبلک ہیلتھ ایکسپرٹ ڈاکٹر فروا یونس سمجھتی ہیں کہ غذائی عدم توازن کا پہلا نشانہ عورت کا جسم بنتا ہے۔ ڈی ڈبلیو سے بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا، "جب خاندان کے مرد اور بچے پہلے کھاتے ہیں اور عورت سب سے آخر میں، تو اسے اکثر وہی کھانا ملتا ہے جو باقی بچتا ہے، یعنی کم غذائیت والا اور ناکافی۔ فولاد، کیلشیم اور پروٹین کی مسلسل کمی عورت کے جسم کو اندر سے کمزور کر دیتی ہے۔ یہ کمی اس کے خون کی مقدار، ہڈیوں کی مضبوطی اور توانائی کے نظام کو بھی متاثر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزمرہ کے معمولات بھی اسے تھکا دینے والے محسوس ہوتے ہیں۔"

بہت سے تحقیقی مطالعے پاکستانی خواتین میں غذائیت کی کمی اور اس کے اثرات واضح کرتے ہیں۔

قومی غذائی سروے 2018 کے مطابق پاکستان میں 15 سے 49 برس تک کی عمر کی خواتین میں خون کی کمی یا انیمیا کی شرح تقریباً 42 فیصد ہے جبکہ اسی عمر کی 34 فیصد خواتین آئرن کی کمی کا شکار بھی ہیں۔ یونیسیف کی رپورٹ 'پاکستان میں ماؤں کی غذائیت کی حکمت عملی' کے مطابق صرف 27 فیصد پاکستانی خواتین ہی اپنی کم از کم غذائی تنوع کی ضروریات پورا کر پاتی ہیں۔ پنجاب فوڈ اتھارٹی کی سرکاری ویب سائٹ پر موجود معلومات کے مطابق اس شعبے کے ڈائریکٹر جنرل عاصم جاوید کا کہنا ہے، ''پاکستان میں 56 فیصد خواتین آئرن کی کمی کا شکار ہیں اور 73 فیصد کو وٹامن ڈی اور 39 فیصد کو وٹامن اے کی کمی کا سامنا ہے۔ تقریباً 28 فیصد خواتین کا وزن ان کی عمر کے لحاظ سے کم جبکہ تقریباً 16 فیصد خواتین کا وزن ان کی عمر کے لحاظ سے زیادہ ہے۔ بطور بہن، ماں، بیوی اور بیٹی اپنی ذمہ داریاں پورا کرتے ہوئے عورتیں اپنی صحت کو مسلسل نظر انداز کر رہی ہوتی ہیں۔''

غذائی امور کے ماہرین کے مطابق خواتین میں آئرن اور دیگر غذائی کمیوں کا تعلق صرف غربت یا وسائل کی کمی سے نہیں، بلکہ ایسے سماجی رویوں سے بھی ہے جو مردوں کو زیادہ طاقتور اور زیادہ حق دار سمجھتے ہیں۔

غذا کی تقسیم میں صنفی امتیاز کہاں سے آیا؟

پاکستانی صوبہ پنجاب کے شہر اوکاڑہ کی دیہی خواتین کی صحت اور غذائیت کے حوالے سے گزشتہ برس شائع ہونے والی ایک تحقیق 'دیہی خواتین میں غذائی استعمال اور غذائی عدم تحفظ سے متعلق صنفی ناہمواری: صورتحال اور وجوہات' کے مطابق، "تقریباً 43 فیصد خواتین نے اعتراف کیا کہ ان کے گھروں میں مردوں کو زیادہ اور بہتر معیار کا کھانا ملتا ہے، جب کہ خواتین کو اس میں برابری حاصل نہیں ہوتی۔"

مزید یہ کہ ''56 فیصد رائے دہندگان نے کہا کہ بیٹوں کو بیٹیوں پر ترجیح دی جاتی ہے اور تقریباً 62 فیصد شرکاء کے مطابق نوجوان خواتین کم غذائیت والے کھانوں کے باعث صحت کے مسائل کا شکار ہیں۔"

اس تحقیق سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا، "صنفی عدم مساوات اور گھریلو آمدنی وہ بنیادی عوامل ہیں، جو دیہی خواتین کی غذائی صورتحال پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔"

ڈی ڈبلیو سے گفتگو کرتے ہوئے ارتقائی علوم کے ماہر زیف سید نے کہا، "گوشت، دودھ، انڈے اور دیگر پروٹین سے بھرپور غذائیں اکثر مردوں کے لیے مخصوص رہتی ہیں، جبکہ خواتین کو کم مقدار میں یا سادہ خوراک دی جاتی ہے۔ اس روایت کی بنیاد یہ خیال ہے کہ مرد زیادہ محنت کرتے ہیں، اس لیے انہیں زیادہ توانائی اور غذائیت کی ضرورت ہے۔ عورت کو 'قربانی' یا 'بچت' کی علامت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، اور یہ تصور مذہبی یا ثقافتی جواز کے ساتھ مستحکم کیا جاتا ہے۔"

زیف سید کے مطابق، ''ارتقائی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ ترجیح انسانی معاشروں میں زندہ رہنے اور تولیدی کامیابی سے جڑی ہو سکتی ہے۔ روایتی معاشرت میں مرد کی جسمانی طاقت اور توانائی کو نسل کی حفاظت اور وسائل حاصل کرنے کے لیے اہم سمجھا گیا، جس کی بنیاد پر مرد کو زیادہ غذائی اجزاء فراہم کرنا ایک منطقی قدم سمجھا جاتا رہا۔ مرد کا کردار ایک کفیل کا تھا، شکار یا بعد میں زراعت کے ذریعے خوراک کا بندوبست کرنا اس کی ذمہ داری رہی۔ یہیں سے غذا میں صنفی عدم توازن ہماری روایات کا حصہ بن گیا۔"

فیصلہ سازی کا حق: پلیٹ کس کی مرضی سے بھرتی ہے؟

پاکستانی گھروں میں کچن کو عموماً خواتین کا دائرہ اثر سمجھا جاتا ہے، مگر کیا وہ اس دائرے میں فیصلہ ساز بھی ہوتی ہیں؟

ڈی ڈبلیو سے بات کرتے ہوئے خواتین کے حقوق کی کارکن ڈاکٹر فاخرہ نورین نے کہا، "عورت کا خود کو پیچھے رکھنا، دوسروں کو پہلے کھلانا اور اپنی بھوک کو ثانوی سمجھنا، معاشرے میں 'ممتا'، 'قناعت' اور 'صبر و شکر' کی علامت قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ دراصل عورت کا آزادانہ انتخاب نہیں ہوتا بلکہ پدرشاہی معاشرت میں پیدا کردہ ذہن سازی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بچپن سے ہی بیٹی دیکھتی ہے کہ ماں سب کو کھلانے کے بعد خود آخر میں کھاتی ہے۔ یوں اسے سکھا دیا جاتا ہے کہ اپنی خواہشات قربان کرنا عورت ہونے کا حصہ ہے۔ یہ اس کا انتخاب نہیں، معاشرے کا دیا ہوا بوجھ ہے، جو نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔ بیٹیاں اپنی ماؤں کی خاموش بھوک کو دہراتی رہتی ہیں۔"

سماجی دانشور سجاد اظہر کے مطابق زیادہ تر گھروں میں خواتین خود کھانا پکاتی ہیں، مگر خوراک کی خریداری اور تقسیم کا فیصلہ مرد کرتے ہیں۔ عورت فیصلہ ساز نہیں ہوتی کیوں کہ وہ معاشی طور پر اپنے خاندان کے مردوں پر انحصار کر رہی ہوتی ہے۔

انہوں نے ڈی ڈبلیو کے ساتھ گفتگو میں کہا، ''پاکستانی معاشرے میں خواتین کی مالیاتی کمزوری کا تعلق صدیوں سے رائج اس روایتی نظام سے ہے، جس میں گھر اور معاشرت کے ہر بڑے فیصلے کا مالک مرد ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے کچن میں بھی فیصلہ کرنے کا حق عورت کے پاس نہیں۔ وہ محنت کرتی ہے، کھانا پکاتی ہے، مگر یہ طے نہیں کرتی کہ کون پہلے کھائے گا، کتنا کھائے گا اور کیا کھائے گا۔ یہ فیصلہ مرد کرتا ہے کیونکہ گھر کی معیشت اسی کے گرد گھومتی ہے، وہ کماتا ہے، اس لیے اس کی مرضی چلتی ہے۔ عورت کی معاشی خود مختاری اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر وہ کبھی فیصلہ ساز نہیں بن سکتی۔''

ادارت: مقبول ملک

(بشکریہ ڈی ڈبلیو)

کوئی بھی ملک اپنے محنت کش ملازمین کی پینشن ختم کر کے ترقی یافتہ نہیں بن سکتا

حافظ محمد صدیق

دنیا کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ کوئی بھی ملک اپنے محنت کش ملازمین کی پینشن ختم کر کے ترقی یافتہ نہیں بن سکتا۔ ترقی کا راستہ عوام کے بنیادی حقوق چھیننے سے نہیں گزرتا بلکہ اس کا واحد دروازہ شفافیت، دیانت داری، اصول پسندی اور بدعنوانی کے مکمل خاتمے سے کھلتا ہے۔ وہ قومیں جنہوں نے اپنے اداروں سے کرپشن کو جڑ سے اکھاڑا آج عالمی سطح پر کامیابی اور استحکام کی مثال سمجھی جاتی ہیں۔ جب کہ وہ معاشرے جو کرپشن کا بوجھ ڈھوتے رہے وہی پسماندگی، غربت، بے روزگاری، انتشار اور بدانتظامی کا شکار ہوئے۔ انہی حقائق کی روشنی میں کہنا بالکل درست ہے کہ ملک کی بقا اور ترقی کے لیے ملازمین کی پینشن نہیں بلکہ کرپشن ختم کرنا سب سے بڑی اور بنیادی قومی ضرورت ہے۔

پینشن کسی پر احسان نہیں بلکہ ایک محنت کش ملازم کی پوری زندگی کی مشقت کا وہ حق ہے جو ریاست اس کی خدمات کے بدلے ادا کرتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک آج اس لیے خوشحال نہیں کہ انہوں نے پینشن یا سوشل سکیورٹی جیسے نظام ختم کر دیئے بلکہ اس لیے کہ وہاں ریاست اپنے شہریوں کو زیادہ سہولیات دیتی ہے، ان کی سوشل سکیورٹی کو بہتر بناتی ہے، بڑھاپے میں انہیں بے سہارا نہیں چھوڑتی اور ان کے بنیادی حقوق کی ضمانت بنتی ہے۔ ان ممالک نے کبھی عوامی حقوق کا خاتمہ کر کے ترقی حاصل نہیں کی بلکہ ترقی کی حقیقی بنیادیں مضبوط اداروں، صاف شفاف حکومتی ڈھانچے، ایماندار قیادت اور غیر جانبدار احتساب کے سخت نظام پر رکھی گئیں۔ یہی وہ اصول ہیں جنہوں نے معاشروں کو ترقی، استحکام اور انصاف کی راہ پر گامزن کیا۔ پینشن ختم کرنے کا مطالبہ نہ معاشی حل ہے، نہ اصلاحات کی علامت بلکہ اس کا نتیجہ محض بے چینی، بے اعتمادی، ملازمین کی مایوسی اور ریاستی اداروں سے وابستہ لاکھوں خاندانوں کی پریشانی کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ معیشت کی مضبوطی کا راستہ کبھی عوام کی سہولتیں ختم کرنے سے نہیں بلکہ بدعنوانی کے ان تمام سوراخوں کو بند کرنے سے کھلتا ہے جن سے ملکی خزانے کا روزانہ اربوں روپے ضائع ہوتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ اصل مسئلہ پینشن نہیں بلکہ کرپشن ہے جس نے پاکستانی معاشرے کو اندر سے کھا لیا ہے اور اداروں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ ہمارے ملک کے اندر کرپشن نے جس طرح اپنی جڑیں مضبوط کی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ گزشتہ سال میں نے اپنے والد محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا فتح محمد چمنی نور اللہ مرقدہ کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ بنوا رہا تھا تو کاروائی کے دوران چمن کے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال میں صرف ایک مہر لگوانے گیا تو صرف مہر لگانے پر تین سو روپے مانگے گئے۔ ہمارے تمام اداروں میں یہی حالات ہیں۔ اسی طرح ہمارے خزانہ آفس میں بھی جائز کام بغیر رشوت دیئے نہیں ہوتا۔ اختیارات کا ناجائز استعمال، رشوت، سفارش، اقربا پروری، ٹینڈرز میں گھپلوں سے لے کر عوامی فنڈز کی خورد برد تک، کرپشن کا دائرہ اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ اب عام آدمی کی زندگی کا کوئی شعبہ اس کی زد سے محفوظ نہیں رہا۔ جب بدعنوانی عام ہوتی ہے تو منصوبے صحیح معنوں میں مکمل نہیں ہوتے، ترقیاتی بجٹ چند ہاتھوں میں سمٹ جاتا ہے، عوامی بہبود کے ادارے مفلوج ہو جاتے ہیں اور معاشرہ ناانصافی کی آگ میں جلنے لگتا ہے۔ ملک میں ایسے منصوبے جن کی اصل لاگت چند ارب ہوتی ہے وہ کرپشن کی وجہ سے کئی گنا زیادہ مہنگے پڑتے ہیں۔ سڑکیں، اسپتال، اسکول، ڈیم، بجلی کے منصوبے۔ سبھی بدعنوانی کی نظر ہو جاتے ہیں۔ یوں عوام کا پیسہ چند قوتوں کے ہاتھ میں منتقل ہوتا رہتا ہے جبکہ عام آدمی کو بنیادی سہولیات تک میسر نہیں آتیں۔ کرپشن کی وجہ سے بجلی، صحت، تعلیم، پانی، صفائی اور ٹرانسپورٹ جیسے بنیادی شعبے زبوں حالی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ عوام کی مشکلات بڑھتی ہیں اور ریاست پر اعتماد کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ جب کسی ملک میں قانون کمزور ہو جائے اور کرپشن طاقتور تو پھر انصاف ناپید ہو جاتا ہے۔

بڑے مجرم آزاد گھومتے رہتے ہیں جبکہ چھوٹے جرائم پر سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔ ایسا دوہرا معیار معاشرے میں بے چینی، غصہ اور محرومی پیدا کرتا ہے۔ عوام جب یہ دیکھتے ہیں کہ قانون اور احتساب صرف کمزوروں کے لیے ہے تو وہ ریاست اور اداروں سے امید کھو بیٹھتے ہیں۔ یہی بے اعتمادی کسی قوم کے لیے سب سے خطرناک ہوتی ہے۔ ملک کی معیشت میں بدعنوانی سے سب سے بڑا دھچکا سرمایہ کاری کو لگتا ہے۔ جب سرمایہ کار جانتے ہوں کہ ان کے منصوبے رشوت، سفارش، سیاسی مداخلت یا بیوروکریسی کی بدعنوانی کی وجہ سے رکے رہیں گے تو وہ سرمایہ لگانے سے گھبرائیں ہیں۔ غیر ملکی سرمایہ کار خصوصاً ایسے ملکوں میں سرمایہ نہیں لگاتے جہاں کرپشن کا تناسب زیادہ ہو اور قوانین غیر یقینی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ہزاروں نوجوان روزگار سے محروم رہتے ہیں، معاشی سرگرمی سست ہو جاتی ہے، ٹیکس کم ملتا ہے اور ملک مسلسل قرضوں میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ اگر ہم واقعی اس ملک کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں بدعنوانی کے خلاف بے رحم، غیر جانبدار اور موثر کارروائی کرنا ہوگی۔ احتساب ایسا ہو جو کسی سفارش، دباؤ، سیاسی تعلقات یا طاقتور شخصیت کی وجہ سے متاثر نہ ہو۔ قانون سب کے لیے برابر ہو چاہے وہ وزیر ہو، مشیر ہو، افسر ہو یا عام شہری۔ اداروں کے اندر ایسی اصلاحات کرنا ہوں گی جن سے میرٹ کی بالادستی قائم ہو، سفارش ختم ہو اور تقرریاں صرف قابلیت کی بنیاد پر ہوں۔ ایک ایسا نظام لانا ہوگا جس میں کارکردگی ہی کامیابی اور ترقی کا معیار ہو۔ ٹیکنالوجی کا بڑھتا ہوا استعمال کرپشن کم کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ آن لائن ٹیکس سسٹم، ای گورننس، ڈیجیٹل ادائیگیاں، شفاف ریکارڈ، بائیومیٹرک تصدیق اور ایسے تمام طریقے جو انسانی مداخلت کم کریں وہ کرپشن کے مواقع بھی کم کر دیتے ہیں۔ ترقی یافتہ دنیا نے یہی راستہ اپنایا اور آج وہ کامیابی کی مثال ہے۔ پاکستان میں بھی اگر تمام سرکاری عمل کو ڈیجیٹل کر دیا جائے تو کرپشن میں نمایاں کمی آ سکتی ہے۔ معاشرے کی اخلاقی تربیت بھی کرپشن کے خاتمے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جب تک لوگوں کے اندر ایمانداری، خوفِ خدا اور امانت داری کا جذبہ پیدا نہیں ہوگا صرف قوانین بنا دینے سے کچھ نہیں بدلے گا۔ نئی نسل کو یہ شعور دینا ہوگا کہ کرپشن صرف قانونی جرم نہیں بلکہ ایک بڑی اخلاقی خیانت اور قومی امانت میں بددیانتی کے مترادف ہے۔ ہمیں اپنے تعلیمی اداروں، گھروں اور معاشرتی نظام میں ایسی تربیت کو فروغ دینا ہوگا جو دیانت داری اور ذمہ داری کا درس دیتی ہو۔ حقیقی ترقی کبھی عوامی سہولتیں ختم کر کے نہیں آتی۔ قومیں تب ترقی کرتی ہیں جب ان کے ادارے مضبوط ہوں، عدل و انصاف کا بول بالا ہو، شہری محفوظ ہوں اور ریاست اپنی ذمہ داریاں پوری کرے۔ پینشن ختم کرنا ترقی کا راستہ نہیں بلکہ اس سے ملک کے لاکھوں خاندان متاثر ہوتے ہیں اور بے یقینی کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہم بدعنوانی کے دروازے بند کر دیں تو وہی رقم جو کرپشن کی نذر ہوتی ہے، ملک کی ترقی اور عوام کی بہبود پر خرچ ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ضرورت پینشن ختم کرنے کی نہیں بلکہ کرپشن کے مکمل خاتمے کی ہے۔ جب ہم یہ سمجھ جائیں گے کہ حقیقی دشمن کرپشن ہے نہ کہ ملازمین کے حقوق تب پاکستان ترقی بھی کرے گا اور خوشحال بھی ہوگا۔ ہمارا مستقبل اس وقت روشن ہوگا جب قانون کی حکمرانی مضبوط ہوگی، احتساب بلا امتیاز ہوگا، میرٹ کا نظام بحال ہوگا اور بدعنوانی کی ہر شکل کو جڑ سے ختم کر دیا جائے گا۔ یہی راستہ ہے جو پاکستان کو پائیدار ترقی، خوشحالی اور استحکام کی طرف لے جا سکتا ہے۔

☆☆☆

عدالت کی حکم عدولی کا نوٹس لیا جائے

خیبر علاقہ مشران کا کہنا ہے کہ پشاور ہائی کورٹ کے فیصلے کے باوجود جمرود میں کرش مشینوں کے مالکان تاحال اپنی مشینیں بند نہیں کر رہے، جو کہ انتہائی قابلِ افسوس بات ہے۔ جمرود پریس کلب میں میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے یونس خان نے اپنے دیگر مشران کی موجودگی میں بتایا کہ ہمارے علاقے تختہ بیگ میں لگی کرش مشینوں کی وجہ سے پورا علاقہ گرد و غبار سے بھر گیا ہے، جس کے نتیجے میں یہاں کئی خطرناک بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ان کا کہنا تھا کہ ہم نے اس مسئلے کے خلاف ایف آئی آر بھی درج کرائی ہے اور پشاور ہائی کورٹ میں بھی کیس دائر کیا تھا، جس پر عدالت نے ان مشینوں کو بند کرنے کا حکم جاری کیا۔لیکن مشینوں کے مالکان نے ابھی تک عدالتی حکم پر عمل نہیں کیا، جو کھلم کھلا توہینِ عدالت ہے۔انہوں نے کہا کہ ہم خیبر پختونخوا کے وزیرِ اعلیٰ سے اپیل کرتے ہیں کہ ان کرش مشینوں کو فوری طور پر بند کرایا جائے، کیونکہ ہم ان بیماری پھیلانے والی مشینوں کو مزید برداشت نہیں کر سکتے

(منظور آفریدی)

مزدور دوران مزدوری ہلاک

ٹنڈو محمد خان ٹنڈو محمد خان میں میونسپل کمیٹی کا سینیٹری ورکر حفاظتی کٹ اور بغیر ایس او پیز کے مین ہول کے اندر صفائی کرنے کے دوران گیس بھر جانے کے باعث دم گھٹنے سے جاں بحق ہوگیا ہے۔ لاش کو ہسپتال منتقل کیا گیا جہاں ڈاکٹرز نے اس کے موت کی تصدیق کی اور لاش ورثاء گھر لے گئے۔ سینیٹری ورکر مسجد اقصی چوک کے قریب مین ہول کی صفائی کے لیے بغیر حفاظتی کٹ اور ایس او پیز کے مین ہول کی صفائی کے لیے اندر گیا تو گیس بھر جانے کے باعث دم گھٹنے سے مین ہول کے اندر ہی بیہوش ہوکر جاں بحق ہوگیا۔ اطلاع پر سماجی تنظیم کے رضا کاروں نے جاں بحق ہونے والے مزدور کو ریسکیو کر کے ہسپتال منتقل کیا جہاں اس کی شناخت گجراتی محلّہ کے 23 سالا انیل کمار ایلس کوڈو ولد کرشن گجراتی کے نام سے ہوئی۔ انیل کمار کی ایک ہفتہ قبل شادی ہوئی تھی اور وہ چھٹی پر تھا لیکن رات کے وقت مین ہول بند ہو جانے کی وجہ سے اس کو انتظامیہ نے ہنگامی طور مین ہول کی صفائی کے لیے طلب کیا جہاں کام کے دوران اس کی موت واقع ہوگئی۔ایک سال قبل اسی روڈ پر مین ہول کی صفائی کے دور بغیر کٹ اور ایس او پیز کے باعث 03 سینیٹری ورکر جاں بحق ہوئے تھے۔

(محمد رمضان شورو)

ضلعی کمیٹی برائے انسانی حقوق کا قیام

شہید بے نظیر آباد سندھ حکومت نے انسانی حقوق کے فروغ اور ان کے تحفظ کو مزید مؤثر بنانے کے لیے ضلع شہید بینظیر آباد میں انسانی حقوق کے تحفظ سے متعلق ضلعی کمیٹی قائم کی ہے۔اس کمیٹی کی سربراہی ڈپٹی کمشنر شہید بینظیر آباد کو سونپی گئی ہے، جب کہ اس میں ایس ایس پی، سپرنٹنڈنٹ جیل، محکمہ خواتین ترقیات، تعلیم، صحت اور سماجی بہبود سمیت مختلف محکموں کے افسران بطور اراکین شامل ہیں۔کمیٹی ضلع میں انسانی حقوق کی مجموعی صورتحال کی نگرانی، خلاف ورزیوں کی نشاندہی اور متاثرین کے کیسز کے ازالے کے لیے سفارشات مرتب کرے گی۔ساتھ ہی یہ ٹیم جیلوں، اسپتالوں، تعلیمی اداروں اور پولیس اسٹیشنز کے دورے کر کے شہریوں کے بنیادی حقوق کے تحفظ کو یقینی بنانے کے اقدامات کرے گی۔ضلعی سطح پر انسانی حقوق سے متعلق آگاہی بڑھانا بھی کمیٹی کی ترجیحات میں شامل ہے، تاکہ عوام میں اپنے حقوق کے بارے میں شعور اجاگر ہو اور سرکاری ادارے انسانی وقار کے تحفظ کے لیے اپنی ذمہ داریاں بہتر انداز میں نبھائیں۔کمیٹی کی رپورٹس اور سفارشات باقاعدگی سے صوبائی اور قومی ٹاسک فورسز کو ارسال کی جائیں گی، جبکہ انسانی حقوق سے متعلق ضلعی سطح پر ہونے والی پیش رفت کا جائزہ بھی مسلسل جاری رکھا جائے گا۔محکمہ انسانی حقوق کے مطابق، کمیٹی کا قیام صوبے میں شہریوں کے بنیادی حقوق کے تحفظ کی جانب ایک اہم پیش رفت ہے جو نہ صرف ادارہ جاتی روابط کو مضبوط کرے گا بلکہ انسانی وقار کے فروغ میں بھی نمایاں کردار ادا کرے گا۔

(آصف البشر خان)

وادی تیراہ سے غیر اعلانیہ نقل مکانی جاری ہے

خیبر وادی تیراہ سے غیر اعلانیہ نقل مکانی جاری ہے اور مقامی آبادی اپنی مدد آپ کے تحت محفوظ مقامات کی جانب منتقل ہو رہی ہے۔غیر مصدقہ اطلاعات کے مطابق، اب تک پانچ سو کے لگ بھگ خاندان وادی تیراہ سے نقل مکانی کر چکے ہیں جبکہ وادی میں رہائش پذیر خاندان غیر یقینی صورتحال سے دوچار ہیں۔مقامی ذرائع نے دعوی کیا ہے کہ وادی تیراہ کے مشران نقل مکانی کے مسئلے پر دو دھڑوں میں تقسیم ہیں جبکہ دوسری طرف وادی تیراہ اور باڑہ کی قیادت کی جانب سے صورتحال کی سنگینی کو عام آدمی سے چھپانے کی کوشش بھی ہو رہی ہے، ایک دھڑا دبے الفاظ میں نقل مکانی کی حمایت جبکہ دوسرا مخالفت کر رہا ہے، تقسیم کے اس ماحول میں اصل نقصان عام آدمی کا ہو رہا ہے اور مستقبل میں بھی سب سے زیادہ نقصان عام آدمی کا ہی ہوگا۔حالات جس جانب بڑھ رہے ہیں اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ وادی تیراہ سے نقل مکانی ہو کر رہے گی جس کا مشاہدہ 2014 میں بھی ہم کر چکے ہیں۔ موجودہ وقت میں حالات اس جانب تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ان تمام حالات کے ذمہ دار نہ صرف وادی تیراہ کے مشران ہوں گے بلکہ منتخب نمائندوں سمیت باڑہ سیاسی اتحاد میں شامل سیاسی جماعتوں پر بھی عائد ہوگی۔ وادی تیراہ انسانی المیے کے در پر کھڑی ہے۔

(اصغر جان آفریدی)

غیر ضروری چیک پوسٹوں کا خاتمہ کیا جائے

نوشکی نوشکی، چاغی، خاران، واشک، لسبیلہ، خضدار، قلات، مستونگ، سوراب، تربت، پنجگور، گوادر، اور آواران اضلاع کے لاکھوں باشندوں کے لیے صوبائی دارالحکومت کوئٹہ کا سفر کرنا عذاب الٰہی سے کم نہیں ہے۔ نوشکی سے کوئٹہ تک 140 کلومیٹر کے فاصلے پر ایف سی، کسٹم اور پولیس کی 8 چیک پوسٹوں سے گزرنا پڑتا ہے۔لک پاس کے قریب واقع چیک پوسٹ سے رخشان مکران اور قلات ڈویژن کے لاکھوں مسافروں کو جو اذیت ملتی ہے اسکا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ایک گھنٹے سے ڈیڑھ گھنٹے تک مسافر بسوں کو روکا جاتا ہے جس کی وجہ سے مسافروں بلخصوص مریضوں خواتین اور بچوں کو انتہائی مشکلات اور وقت کے ضیاع سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لکپاس کافی سرد علاقہ ہے جس سے مسافروں کو انتہائی تکالیف سے دوچار ہونا پڑتا ہے جبکہ دوسری جانب متبادل کچے راستوں سے بڑے پیمانے پر اسمگلنگ کا بازار گرم ہے۔مسافروں کو مشکلات، پریشانی اور وقت کے ضیاع سے دوچار کرنا انسانی حقوق کے خلاف ورزی کے زمرے میں آتا ہے۔رخشان قلات اور مکران ڈویژن کے عوام نے کور کمانڈر بلوچستان، گورنر بلوچستان، وزیر اعلیٰ بلوچستان، چیف سیکرٹری بلوچستان اور دیگر اعلیٰ حکام کی توجہ اس مسئلہ کی جانب مبذول کراتے ہوئے مطالبہ کیا ہے۔عوام کی مشکلات اور وقت کے ضیاع کو مدنظر رکھتے ہوئے بلوچستان میں چیک پوسٹوں کی تعداد پر نظر ثانی اور مسافروں کو سفر کی بہتر سہولیات کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں اور شام پانچ بجے کے بعد مسافر بسوں، ٹرکوں اور ٹرالر پر نقل و حمل کی پابندی ہٹائی جائے کیونکہ ڈرائیوروں اور دیگر مسافروں کو چیک پوسٹوں پر روکنے اور سہولیات کی عدم فراہمی کے باعث کئی دشواریوں اور وقت کے ضیاع سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔یہ سلسلہ گزشتہ ایک سال سے جاری ہے جو بلوچستان کے عوام کے ساتھ ظلم ہے۔

(محمد سعید)

بنیادی سہولیات سے محرومی

خیبر علی مسجد کے علاقے شینگ تنگ کے اختر ولی، حاجی واشیر، صندل اور دیگر عمائدین نے جمرود پریس کلب میں ایک اہم پریس کانفرنس کرتے ہوئے حکومت سے بنیادی سہولیات کی فراہمی کا مطالبہ کیا۔ مقررین کا کہنا تھا کہ اکیسویں صدی میں بھی شینگ تنگ جیسے بڑے اور کثیر آبادی والے علاقے کو سڑک کی بنیادی سہولت میسر نہ ہونا انتہائی افسوسناک اور حکومتی غفلت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ رابطہ سڑک نہ ہونے کے باعث ہزاروں خاندان شدید مشکلات سے دوچار ہیں۔ عمائدین نے شکوہ کیا کہ علاقے کے مکین آج بھی مریضوں اور میتوں کو کندھوں پر اٹھا کر دشوار گزار راستوں سے لانے پر مجبور ہیں، حالانکہ یہ جدید دور میں کسی طور بھی قابل قبول نہیں۔ انہوں نے بتایا کہ شینگ تنگ کے عوام سابق ایم این اے الحاج شاہ جی گل اور ایم این اے اقبال آفریدی سے کئی بار سڑک کی منظوری کا مطالبہ کر چکے ہیں، مگر بدقسمتی سے یہ اہم منصوبہ تاحال عملی شکل اختیار نہیں کر سکا۔ پریس کانفرنس میں موجود شخصیات نے موجودہ وزیر اعلیٰ محمد سہیل آفریدی سے خڑہ دامہ سے شین غر قبروں میلہ تک تین کلومیٹر سڑک کی فوری منظوری دینے کا پُرزور مطالبہ کیا تاکہ مقامی آبادی کی دیرینہ مشکلات کا خاتمہ ہو سکے۔ عمائدین نے واضح کیا کہ اگر متعلقہ حکام نے جلد از جلد اس اہم عوامی مسئلے کو حل نہ کیا تو علی مسجد شینگ تنگ کے مکین پولیو مہم اور ووٹ کا بائیکاٹ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ انہوں نے حکومت سے اپیل کی کہ وہ علاقے کا ازسرِ نو سروے کر کے روڈ کے منصوبے کو ترجیحی بنیادوں پر مکمل کروائے تاکہ لوگوں کا ریاست پر اعتماد بحال ہو سکے۔

(منظور آفریدی)

مزدور جاں بحق

جمرود جمرود شاکس میں واقع انٹرفوم فیکٹری میں کام کے دوران ایک افسوسناک حادثے میں مزدور امید خان ولد عبدولی خان سکنہ نئی آبادی جمرود جان کی بازی ہار گئے۔ ورثا کے مطابق مرحوم امید خان فیکٹری کی ایک مشین کی صفائی کر رہے تھے کہ اچانک مشین چل پڑی، جس کے باعث وہ شدید زخمی ہو گئے۔ انہیں فوری طور پر طبی امداد کے لیے ہسپتال منتقل کیا گیا، تاہم وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دم توڑ گئے۔

(مسعود شاہ)

این ایل سی کیمپ، تختہ بیگ، اور ٹی ڈی بازار میں مقیم مہاجرین کھلے آسمان تلے بے یارومددگار زندگی گزارنے پر مجبور

خیبر متعدد خواتین، بچے اور بزرگ مختلف مہلک امراض جیسے ڈینگی، ملیریا، کھانسی اور سینے (چیسٹ) کی بیماریوں میں مبتلا ہیں، جبکہ وہاں نہ پینے کا صاف پانی، نہ خوراک، نہ میڈیکل کیمپ، اور نہ واش رومز کی سہولیات دستیاب ہیں۔ افغان مہاجرین نے شکایات کے انبار لگا دیے۔ انہوں نے

بتایا کہ انہیں خاص طور پر کھانے کی قلت اور ناقص نا شتے کا سامنا ہے۔ افغان مہاجرین نے دونوں ممالک کے ذمہ داران کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے اپیل کی کہ خدا کے لیے، جو افغان پناہ گزین اپنے گھروں سے نکل آئے ہیں، ان کے لیے کم از کم سرحد (بارڈر) کھول دی جائے تاکہ وہ واپس جا سکیں۔ متاثرین کی تعداد بہت زیادہ ہے، اس لیے ہر تک پہنچنا مشکل ہے۔ ہم صاحبِ حیثیت افراد سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ آگے بڑھیں اور ساتھ مل کر ان افغان بھائیوں کی مدد کریں۔

(مسعود شاہ)

غیر ضروری چیک پوسٹوں کا خاتمہ کیا جائے

نوشکی نوشکی، چاغی، خاران، واشک، لسبیلہ، خضدار، قلات، مستونگ، سوراب، تربت، پنجگور، گوادر، اور آواران اضلاع کے لاکھوں باشندوں کے لیے صوبائی دارالحکومت کوئٹہ کا سفر کرنا عذاب الٰہی سے کم نہیں ہے۔ نوشکی سے کوئٹہ تک 140 کلومیٹر کے فاصلے پر ایف سی، کسٹم اور پولیس کی 8 چیک پوسٹوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ لک پاس کے قریب واقع چیک پوسٹ سے رخشان مکران اور قلات ڈویژن کے لاکھوں مسافروں کو جو اذیت ملتی ہے اسکا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ایک گھنٹے سے ڈیڑھ گھنٹے تک مسافر بسوں کو روکا جاتا ہے جس کی وجہ سے مسافروں بلخصوص مریضوں خواتین اور بچوں کو انتہائی مشکلات اور وقت کے ضیاع سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لکپاس کافی سرد علاقہ ہے جس سے مسافروں کو انتہائی تکالیف سے دوچار ہونا پڑتا ہے جبکہ دوسری جانب متبادل کچے راستوں سے بڑے پیمانے پر اسمگلنگ کا بازار گرم ہے۔ مسافروں کو مشکلات، پریشانی اور وقت کے ضیاع سے دوچار کرنا انسانی حقوق کے خلاف ورزی کے زمرے میں آتا ہے۔ رخشان قلات اور مکران ڈویژن کے عوام نے کور کمانڈر بلوچستان، گورنر بلوچستان، وزیر اعلیٰ بلوچستان، چیف سیکرٹری بلوچستان اور دیگر اعلیٰ حکام کی توجہ اس مسئلہ کی جانب مبذول کراتے ہوئے مطالبہ کیا ہے۔ عوام کی مشکلات اور وقت کے ضیاع کو مدنظر رکھتے ہوئے بلوچستان میں چیک پوسٹوں کی تعداد پر نظر ثانی اور مسافروں کو سفر کی بہتر سہولیات کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں اور شام پانچ بجے کے بعد مسافر بسوں، ٹرکوں اور ٹرالر پر نقل و حمل کی پابندی ہٹائی جائے کیونکہ ڈرائیوروں اور دیگر مسافروں کو چیک پوسٹوں پر روکنے اور سہولیات کی عدم فراہمی کے باعث کئی دشواریوں اور وقت کے ضیاع سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ سلسلہ گزشتہ ایک سال سے جاری ہے جو بلوچستان کے عوام کے ساتھ ظلم ہے۔

(محمد سعید)

پولیس کے مبینہ تشدد سے ہلاکت

سانگھڑ شہداد پور میں استاد جام عزیز جکھرو کے مبینہ پولیس تشدد سے جاں بحق ہونے کے واقعے پر ایس ایس پی سانگھڑ عابد بلوچ نے اپنا بیان جاری کرتے ہوئے کہا کہ فی الوقت ایس ایچ او شہداد پور سمیت تین پولیس اہلکاروں کو معطل کر دیا گیا ہے، جبکہ ملزمان کی گرفتاری کے لیے چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ ایس ایس پی کے مطابق پوسٹ مارٹم مجسٹریٹ کی نگرانی میں کرایا جائے گا تاکہ ورثا کو مکمل اطمینان حاصل ہو۔ انہوں نے کہا کہ واقعہ چونکہ پولیس کسٹڈی میں پیش آیا ہے، اس لیے قانون کے مطابق کارروائی کی جا رہی ہے اور ایف آئی اے کو بھی رپورٹ لکھ کر بھیج دی گئی ہے۔ ایس ایس پی عابد بلوچ نے کہا کہ ہماری ہمدردی ورثا کے ساتھ ہے اور انصاف کے تقاضے پورے کیے جائیں گے۔

(ابراہیم خلجی)

واپڈا کی ممکنہ نجکاری کے خلاف احتجاج

ٹنڈو محمد خان آل پاکستان واپڈا ہائیڈرو الیکٹرک یونین (سی بی اے) آپریشن ڈویژن حیسکو ٹنڈو محمد خان کی جانب سے واپڈا کی ممکنہ نجکاری کے خلاف گرڈ اسٹیشن سے سجاول چوک تک ریلی نکال کر احتجاجی مظاہرہ کیا گیا۔ مظاہرین نے وفاقی حکومت کی نجکاری پالیسی کے خلاف نعرے بازی کی۔ خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وفاقی حکومت اداروں کی نجکاری کر کے انہیں تباہ و برباد نہ کرے وفاقی وزیر بجلی و توانائی ایس لغاری کا اعترافی بیان موجود ہے کہ ہم نے بجلی کی تقسیم کار کمپنیوں سے معاہدے ختم کر کے کھربوں روپے کی بچت کی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ پاکستان ہائیڈرو الیکٹرک یونین کا موقف بالکل حقائق پر مبنی اور درست ہے حکومت نے ماضی میں نجکاری کے جتنے بھی معاہدے کئے ہیں وہ ادارے تباہ و برباد ہو گئے ہیں اس لئے ہم واپڈا کو کسی بھی قیمت پر نجکاری کے حوالے نہیں ہونے دیں گے، وفاقی حکومت اداروں کی نجکاری کے نام پر قومی اداروں کو تباہی کی طرف لے جا رہی ہے۔

واپڈا جیسے مستحکم اور منافع بخش ادارے کو نجی ہاتھوں میں دینا ملک و عوام دونوں کے مفاد کے خلاف ہے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اگر حکومت نے واپڈا کی نجکاری کے منصوبے واپس نہ لیے تو احتجاج کا دائرہ کار مزید وسیع کیا جائے گا اور اسلام آباد تک مارچ کیا جائے گا۔ ریلی کے آخر میں حیسکو ٹنڈو محمد خان کے ملازم رضا قریشی اور پورے ملک میں واپڈا میں خدمات سرانجام دینے والے کے لئے خصوصی دعا مانگی گئی۔ اس موقع پر زاہد علی کھوسو ڈویژنل چیئرمین، یونس نظامانی چیئرمین سب ڈویژن 2، رشید احمد میمن چیئرمین سب ڈویژن 1، سجاد علی سٹھیو چیئرمین سب ڈویژن بلڑی شاہ کریم، عبدالعزیز میمن ڈویژنل سیکریٹری،، ارجن کمار دویژنل وائس چیئرمین، فیاض علی میمن سیکریٹری سب ڈویژن 1، عابد علی ہالیپوٹو سیکریٹری سب ڈویژن 2، میر عامر علی ٹالپر سیکریٹری سب ڈویژن بلڑی شاہ کریم، عبدالروف کمبھار سیکریٹری سب ڈویژن ماتلی، میر ظہیر ٹالپر جوائنٹ سیکریٹری سب ڈویژن 1، میر رشید علی ٹالپر جوائنٹ سیکریٹری سب ڈویژن 2، امیر عثمان جوائنٹ سیکریٹری سب ڈویژن بلڑی شاہ کریم، محمد اکرم گنبو وائس چیئرمین سب ڈویژن ماتلی، محمد سلیمان جوائنٹ سیکریٹری سب ڈویژن ماتلی نے مظاہرین سے خطاب کیا۔

(یعقوب لطیف سومرو)

پشتون طلباء خیبر کی جانب سے ایک پُرامن احتجاجی مظاہرہ

خیبر آج باڑہ بازار میں پشتون طلباء خیبر کی جانب سے ایک پُرامن احتجاجی مظاہرہ کیا گیا، جس میں باڑہ سیاسی اتحاد صدر ہاشم آفریدی، اے این پی خیبر سنیئر رہنما صدیق چراغ، جی ایس اے این پی باڑہ سبحان آفریدی، پی ٹی آئی سنیئر رہنما واجد شاہ آفریدی سمیت مختلف طلباء تنظیموں نے بھرپور شرکت کی۔ مظاہرے کا مقصد حبیب وزیر، عدنان وزیر اور دیگر جبری لاپتہ طلباء و مشران کی بازیابی کا مطالبہ تھا۔ مقررین نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:

- آئین پاکستان کا آرٹیکل 10-A ہر شہری کو منصفانہ ٹرائل کا حق دیتا ہے، جب کہ آرٹیکل 9 زندگی کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ جبری گمشدگیاں ان آئینی حقوق کی صریح خلاف ورزی ہیں۔
- ہم پشاور یونیورسٹی کے پشتون طلباء کی جانب سے دی گئی ڈیڈ لائن کی مکمل حمایت کرتے ہیں، اور اعلان کرتے ہیں کہ اگر مطالبات تسلیم نہ کیے گئے تو اگلا احتجاجی مرکز پشاور ہوگا۔
- ہم پُرامن آئینی جدوجہد پر یقین رکھتے ہیں، مگر ریاست کو بھی یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ہم اپنی شناخت، آزادی اظہار اور بنیادی حقوق پر کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے۔

پشتون طلباء خیبر نے واضح کیا کہ وہ ہر اُس اقدام کی حمایت کرے گی جو آئین و قانون کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے طلباء کے حق میں ہوگا۔ جبری گمشدگیاں بند کرو۔ پشتون طلباء کی آواز کو دبایا نہیں جا سکتے۔

(مسعود شاہ)

خاتون کو تحفظ دینے کے بجائے اس سے جنسی زیادتی کر ڈالی

میانوالی تفصیلات مطابق کالاباغ کے نواحی علاقے کوٹ چاندنہ کی رہاشی سدرہ بی بی زوجہ انوار الحسن رات گیارہ بجے اپنے شوہر کے ساتھ ٹیلی فون پر ناراض ہو کر گھر سے نکل گئی اور کالاباغ آ گئی۔ وہاں سے گاڑی پر سوار ہو کر میانوالی لاری اڈا آ گئی۔ لاری اڈا پر عرفان گل نامی رکشہ والے کے ساتھ مسلم کالونی میانوالی سٹی کے لیے سوار ہوئے رات تین بجے رکشہ ڈرائیور دھوکے سے دو کلومیٹر دور مجھے شہباز خیل لے گیا۔ وہاں پہنچے تو دو افراد اور آ گئے اور مجھے زبردستی پکڑ کر بیٹھک میں لے گئے اور کئی روز تک جنسی زیادتی کرتے رہے۔ 8 نومبر کو دس بجے میں موقع پا کر وہاں سے فرار ہو گئی اور تھانے رپورٹ کروانے پہنچ گئی۔ خاتون کی رپورٹ پر پولیس نے تین ملزمان کے خلاف جنسی زیادتی کا مقدمہ درج کر لیا ہے اور ملزمان کی گرفتاری کے لیے چھاپے مارے جا رہے ہیں۔

(محمد رفیق)

18 سالہ لڑکی قتل

لڑکی کو فائرنگ کر کے قتل کیا گیا۔ پولیس نے مقدمہ درج کر لیا ہے۔ مقتولہ کے والد نے داماد پر بیٹی کے قتل کا الزام عائد کر دیا۔ والد کے مطابق داماد نے فون پر قتل کی اطلاع دی۔ مقتولہ کے والد نے الزام لگایا کہ اس کے داماد نے ناجائز تعلقات کے شبے پر اسے قتل کیا ہے۔ پولیس نے مقدمہ درج کر لیا تھا۔ ملزم تا حال مفرور تھا۔ قتل ہونے والی لڑکی کے والد کا کہنا ہے کہ کو رات تین بجے گولیاں ماری گئیں، صبح تک زندہ تھی مگر ملزم نے صبح دوبارہ فائرنگ کر کے اسے جاں بحق کر دیا۔

(مسعود شاہ)

طالب علم کو قتل کر دیا گیا

میانوالی موچھ کے نواحی علاقہ تری خیل میں 15/16 سالہ نہم کلاس کا طالب علم عماد خان ولد عبدالستار رات آٹھ بجے کے لگ بھگ تندور سے روٹی لینے گیا تو نامعلوم افراد نے فائرنگ کر کے قتل کر دیا۔ انوسٹیگیشن و فرانزک ٹیموں نے جائے وقوعہ سے شواہد اکھٹے کئے۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ مقتول کے والد کی مدعیت میں مقدمہ درج کر لیا گیا ہے۔ واقعہ 6 نومبر کو پیش آیا تھا۔

(محمد رفیق)

عورتیں

ہر روز 137 خواتین کا اپنے ہی عزیز و اقارب کے ہاتھوں قتل

اقوام متحدہ کے ادارہ برائے انسداد منشیات و جرائم (یو این او ڈی سی) اور یو این ویمن نے کہا ہے کہ خواتین کے خلاف تشدد کی روک تھام کے وعدوں کے باوجود صورتحال میں قابل ذکر بہتری نہیں آ سکی۔ 2024 میں 50 ہزار خواتین اور لڑکیوں کو ان کے قریبی ساتھیوں یا خاندان کے افراد نے قتل کیا۔ خواتین کے خلاف تشدد کے خاتمے کے عالمی دن پر یو این ویمن کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ گزشتہ سال 83,000 خواتین اور لڑکیوں کو دانستہ قتل کیا گیا جن میں سے 60 فیصد کو ان کے قریبی ساتھیوں یا خاندان کے ارکان نے ہلاک کیا۔

آف لائن اور آن لائن تشدد

خواتین پر تشدد کے خلاف اقوام متحدہ کی سولہ روزہ مہم میں واضح کیا گیا ہے کہ ڈیجیٹل تشدد صرف آن لائن نہیں رہتا بلکہ یہ حقیقی زندگی کو بھی سنگین نقصان پہنچا سکتا ہے، جس کا بدترین نتیجہ خواتین کا قتل ہے۔ ہر خاتون اور ہر لڑکی کو زندگی کے ہر حصے میں محفوظ رہنے کا حق حاصل ہے اور اس کے لیے ایسے نظام درکار ہیں جو انہیں بروقت تحفظ دیں۔ ہلاکتوں کو روکنے کے لیے ضروری ہے کہ ایسے قوانین پر عمل درآمد ہو جن میں خواتین اور لڑکیوں کی زندگیوں میں آن لائن اور آف لائن دونوں طرح کے تشدد کو تسلیم کیا جائے اور مجرموں سے جواب طلبی ہو۔

درست معلومات کی ضرورت

رپورٹ کے مطابق، قریبی ساتھی یا خاندان کے کسی فرد کے ہاتھوں قتل کی سب سے زیادہ شرح افریقہ میں (ایک لاکھ میں تین) ہے۔ اس کے بعد امریکا (ایک لاکھ میں 1.5)، اوشیانا (ایک لاکھ میں 1.4)، پھر ایشیا (ایک لاکھ میں 0.7) اور اس کے بعد یورپ (ایک لاکھ میں 0.5) کا نمبر آتا ہے۔ اگرچہ گھروں سے باہر خواتین کے قتل بھی ایک حقیقت ہیں لیکن اس بارے میں معلومات نہایت محدود ہیں۔ ان خامیوں کو دور کرنے کے لیے یو این ویمن اور 'یو این او ڈی سی' رکن ممالک کے ساتھ مل کر 2022 کے شماریاتی فریم ورک کے نفاذ پر کام کر رہے ہیں جس کا مقصد خواتین اور لڑکیوں کے جنس پر مبنی قتل کی بہتر شناخت، دستاویز کاری اور درجہ بندی ہے۔ درست اور مکمل معلومات کی دستیابی ایسے قتل کے حقیقی حجم اور اثرات کو سمجھنے، اس حوالے سے موثر اقدامات کی تشکیل اور انصاف کے لیے بہت اہم ہوگی۔

(بشکریہ یو این خبرنامہ)

دنیا کی 22 کروڑ 40 لاکھ خواتین موثر مانع حمل ذرائع تک رسائی سے محروم

1990 کی دہائی کے بعد سے دنیا بھر میں جدید مانع حمل طریقے استعمال کرنے والے افراد کی تعداد دوگنا بڑھ چکی ہے لیکن اس کے باوجود تقریباً 22 کروڑ 40 لاکھ خواتین اب بھی خاندانی منصوبہ بندی کے محفوظ اور موثر طریقے استعمال نہیں کرتیں۔

جنسی و تولیدی صحت کے لیے اقوام متحدہ کے ادارے (یو این ایف پی اے) نے بتایا ہے کہ مانع حمل کے استعمال میں اضافہ صحت عامہ کی ایک بڑی کامیابی ہے جس نے لاکھوں خواتین کو غیر ارادی حمل سے بچنے اور اپنے مستقبل کے بارے میں آزادانہ فیصلے کرنے کے قابل بنایا۔ تاہم، ادارے نے خبردار کیا ہے کہ اب بھی بہت سے افراد کا بچوں کی پیدائش پر اپنے اختیار کا بنیادی انسانی حق پامال ہو رہا ہے۔

ادارے کا کہنا ہے کہ زیادہ تر ترقی پذیر علاقوں میں رہنے والی خواتین کو جدید مانع حمل تک رسائی نہیں ہوتی۔ ان کی عدم دستیابی کے نتیجے میں غیر ارادی حمل میں اضافہ ہوتا ہے اور غیر محفوظ اسقاط حمل کے باعث زچگی کے دوران اموات کی شرح بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس کے اثرات صحت سے کہیں بڑھ کر ہوتے ہیں اور لڑکیوں میں نوعمری کے حمل، سکول چھوڑنے کے خدشات اور صنفی بنیاد پر تشدد کے خطرے میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

'یو این ایف پی اے' کی ایگزیکٹو ڈائریکٹر ڈین کیتا نے کہا ہے کہ مانع حمل طریقے زندگیاں بچاتے ہیں اور ان کے اہم معاشی فوائد بھی ہیں۔ مانع حمل سہولتوں پر خرچ ہونے والے ہر ایک ڈالر کے بدلے میں تقریباً 27 ڈالر کے معاشی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

مانع حمل بارے پانچ غلط فہمیاں

1۔ مانع حمل طریقے غیر محفوظ ہیں

'یو این ایف پی اے' کے مطابق جدید مانع حمل ادویات دنیا میں سب سے زیادہ تجویز کردہ اور سب سے زیادہ تحقیق شدہ ادویات میں شامل ہیں۔

غیر ارادی حمل سے وابستہ طبی خطرات کسی بھی تجویز کردہ مانع حمل طریقے سے لاحق خطرات کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔

2۔ مانع حمل ادویات اسقاط حمل کا باعث بنتی ہیں

مانع حمل طریقے اسقاط حمل یا حمل ضائع ہونے کا سبب نہیں بنتے۔ یہ بیضہ بننے کے عمل کو روک کر کام کرتے ہیں یعنی حمل کو ہونے سے پہلے ہی روک دیتے ہیں۔

3۔ ضبط تولید سے تولیدی صلاحیت متاثر ہوتی ہے

مانع حمل ادویات بانجھ پن کا باعث نہیں بنتیں۔ بعض ہارمونی طریقے (جیسا کہ انجیکشن) بیضہ بننے اور حیض کے دوبارہ شروع ہونے میں عارضی تاخیر پیدا کر سکتے ہیں لیکن یہ مستقل بانجھ پن کا سبب نہیں بنتے۔

4۔ قدرتی مانع حمل طریقے ہارمونی طریقوں سے زیادہ محفوظ ہیں

آج کل ایام حیض کی نگرانی یا جسمانی درجہ حرارت دیکھ کر باروری سے آگاہی جیسے متبادل طریقے سوشل میڈیا پر مقبول ہو رہے ہیں لیکن ادارے کا کہنا ہے کہ یہ طریقے حمل روکنے میں واضح طور پر کم موثر ہیں۔

5۔ اگر آپ غیر شادی شدہ ہیں یا آپ کا ساتھی نہیں چاہتا تو مانع حمل استعمال نہیں کرنا چاہیے

تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ جن نوجوانوں کو جنسی و تولیدی صحت سے متعلق معلومات اور سہولیات میسر ہوتی ہیں وہ زیادہ جنسی سرگرمی میں ملوث نہیں ہوتے بلکہ انہیں یہ معلومات ذمہ دارانہ فیصلے کرنے کے قابل بناتی ہیں۔

'یو این ایف پی اے' نے کہا ہے کہ ہر خاتون کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ فیصلہ کرے کہ اسے حاملہ ہونا ہے یا نہیں۔ کسی کو بھی تحفظ کے بغیر جنسی تعلق پر مجبور نہیں کیا جانا چاہیے۔ یہ تولیدی جبر ہے جو بدسلوکی کے زمرے میں آتا ہے۔

(بشکریہ یو این خبرنامہ)

بچے

لڑکی سے مبینہ جنسی زیادتی

میانوالی میانوالی سٹی کی پولیس نے کاروائی کرتے ہوئے تین ملزمان مدثر، امجد، جمشید کو گرفتار کرلیا ہے۔ان تین ملزمان پر الزام ہے کہ انہوں نے 19 سالہ لڑکی سے جنسی زیادتی کی ہے۔ لڑکی کے بھائی کی مدعیت میں مقدمہ درج کردیا گیا ہے۔

(محمد رفیق)

سات بے گناہ بچے اور خواتین زخمی

خیبر وادی تیراہ شلوبر میں ہونے والی کواڈکاپٹر بمباری نے ایک بار پھر علاقے کے پرامن شہریوں کو لرزا کر رکھ دیا۔ بمباری کسی عسکری ٹھکانے یا مشتبہ مقام پر نہیں بلکہ ایک عام شہری وارث خان ولد تاج خان کے گھر پر کی گئی جس کے نتیجے میں خاتون اور کمسن بچوں سمیت سات بے گناہ افراد شدید زخمی ہوگئے۔ بمباری میں معمر شخص وارث خان اور ان کی اہلیہ، ضابط خان، چار سالہ طلحہ ولد اورنگزیب، پانچ سالہ صفہا دختر اورنگزیب، پانچ سالہ شبنم دختر ضابط خان، چھ سالہ ثناء دختر ضابط خان، اور دو سالہ سیدولی ولد ضابط خان شامل ہیں۔ تمام زخمیوں کو فوری طور پر پانچ بلوچ باغ کے ہیڈکوارٹر ایف ٹی سی منتقل کیا گیا جہاں انہیں طبی امداد فراہم کی جارہی ہے۔مقامی ذرائع نے بتایا ہے کہ زخمیوں کی حالت خطرے سے باہر ہے تاہم اہلِ علاقہ میں خوف وہراس کی فضا بدستور قائم ہے۔عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ یہ بمباری کسی عسکری ہدف پر نہیں بلکہ عام شہری آبادی پر کی گئی جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ کارروائی کولیٹرل ڈیمیج نہیں بلکہ عوام کے خلاف براہِ راست ظلم و جبر کی مثال ہے۔اہلِ علاقہ نے واقعے کی شدید مذمت کرتے ہوئے اعلیٰ حکام سے مطالبہ کیا ہے کہ ایسے بے مقصد اور ظالمانہ حملوں کی تحقیقات کی جائیں اور مستقبل میں معصوم شہریوں کی جانوں کا تحفظ یقینی بنایا جائے۔ایک اور واقع میں وادی تیراہ شلوبر میں شادی ولیمہ کے پروگرام پر ڈرون حملہ ہوا، جس میں بچوں سمیت آٹھ افراد زخمی ہوئے۔

(مسعود شاہ)

کروڑوں بچوں کو اپنی ماؤں پر تشدد ہوتا دیکھنے کے کرب کا سامنا، یونیسف

اقوام متحدہ کے ادارہ برائے اطفال (یونیسف) نے بتایا ہے کہ دنیا بھر میں 61 کروڑ بچے ایسی ماؤں کے ساتھ رہتے ہیں جو گزشتہ سال کے دوران اپنے مرد ساتھیوں کے ہاتھوں جسمانی، جذباتی یا جنسی تشدد کا شکار ہوئیں۔اس تشدد کے بچوں پر سب سے زیادہ اثرات اوشیانیا، ذیلی صحارا افریقہ اور وسطی وجنوبی ایشیا میں نظر آتے ہیں جس سے عالمی سطح پر خواتین کے خلاف تشدد کے وسیع تر رجحانات اور خطوں کے درمیان گہری عدم مساوات کی عکاسی ہوتی ہے۔یونیسف کی ایگزیکٹو ڈائریکٹر کیتھرین رسل کے مطابق، آج بھی لاکھوں خواتین اور بچے ایسے گھروں میں رہتے ہیں جہاں تشدد معمول کی بات ہے۔خواتین کا تحفظ اور خودمختاری بچوں کی بھلائی کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزی

یہ تجزیہ خواتین کے خلاف تشدد سے متعلق اقوام متحدہ کے حالیہ عالمی تخمینوں کے بعد سامنے آیا ہے۔ان کے مطابق، گزشتہ 12 ماہ کے دوران 15 سال یا اس سے زیادہ عمر کی ہر 10 میں سے ایک لڑکی یا خاتون اپنے کسی قریبی مرد ساتھی کے ہاتھوں جسمانی یا جنسی تشدد کا شکار ہوئی۔خواتین کے خلاف تشدد خصوصاً گھریلو اور جنسی تشدد ایک بڑا عوامی وطبی مسئلہ اور خواتین کے انسانی حقوق کی صریح خلاف ورزی ہے۔ یہ مسئلہ صنفی عدم مساوات سے جڑا ہوا ہے اور اسے مزید بڑھاتا ہے۔عالمی سطح پر ہر تین میں سے ایک خاتون اپنی زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ جسمانی یا جنسی تشدد کا سامنا کرتی ہے اور اکثر اوقات یہ تشدد کسی قریبی شریک حیات کی جانب سے ہوتا ہے جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ صنفی عدم مساوات اور خواتین کے خلاف امتیاز کس قدر وسیع ہے۔

خواتین اور بچوں کے لیے 'خطرناک' علاقے

یونیسف نے پہلی مرتبہ ایسے علاقوں کی نشاندہی بھی کی ہے جہاں خواتین اور بچوں کو سب سے زیادہ خطرہ لاحق ہے۔اوشیانیا میں نصف سے کچھ زیادہ (تقریباً 30 لاکھ) بچے ایسی ماؤں کے ساتھ رہتے ہیں جو حال ہی میں گھریلو تشدد کا شکار ہوئی ہیں۔ذیلی صحارا افریقہ 32 فیصد کے ساتھ دوسرے نمبر پر ہے جہاں 187 ملین بچے اس تشدد سے بالواسطہ متاثر ہیں۔وسطی وجنوبی ایشیا میں یہ شرح 29 فیصد ہے مگر یہاں متاثر ہونے والے بچوں کی تعداد سب سے زیادہ یعنی 201 ملین ہے۔

دیگر علاقائی نتائج درج ذیل ہیں:

- شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا: 26 فیصد (پانچ کروڑ 20 لاکھ بچے)
- مشرقی اور جنوب مشرقی ایشیا: 21 فیصد (10 کروڑ 50 لاکھ بچے)
- لاطینی امریکہ اور غرب الہند: 19 فیصد (تین کروڑ 50 لاکھ بچے)
- یورپ اور شمالی امریکہ: 13 فیصد (دو کروڑ 80 لاکھ بچے)
- آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ: 5 فیصد (تقریباً 4 لاکھ بچے)

بچوں پر تشدد کے طویل مدتی اثرات

یونیسف نے خبردار کیا ہے کہ ایسے گھروں میں رہنے والے بچے سنگین جسمانی وذہنی خطرات سے دوچار ہوتے ہیں جہاں مائیں تشدد برداشت کررہی ہوتی ہیں۔خواہ بچوں پر تشدد نہ کیا جائے تو تب بھی تشدد کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا بچوں اور ان کے سرپرستوں کے درمیان اعتماد کو کمزور کردیتا ہے، گہرے جذباتی زخم چھوڑتا ہے اور ایسا صدمہ دیتا ہے جو عموماً عمر بھر ان کے ساتھ رہتا ہے۔گھریلو تشدد کے ماحول میں پرورش پانے والے بچوں کے خود تشدد کا شکار ہونے یا تشدد کرنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، جس کے ان کی حفاظت، نشوونما، صحت اور تعلیم پر دیرپا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔یونیسف نے حکومتوں سے خواتین وبچوں کے خلاف تشدد سے نمٹنے کے لیے جامع حکمت عملی اپنانے پر زور دیا ہے اور اس ضمن میں خواتین اور لڑکیوں کی قیادت میں چلنے والی تنظیموں کو مضبوط کرنے کی ضرورت واضح کی ہے۔ادارے نے متاثرہ خواتین کے لیے سہولتوں تک آسان رسائی، تشدد کی روک تھام کے لیے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری بشمول والدین کی رہنمائی اور سکولوں پر مبنی پروگرام شروع کرنے، نقصان دہ سماجی رویوں کی حوصلہ شکنی اور متاثرین ونوجوانوں کی آوازوں کو پھیلانے کے لیے بھی کہا ہے۔

(بشکریہ یواین خبرنامہ)

عالمی یوم اطفال: دنیا کے کروڑوں بچے غربت کا شکار، یونیسف

اقوام متحدہ کے ادارہ برائے اطفال (یونیسف) نے بتایا ہے کہ دنیا میں 41 کروڑ 70 لاکھ بچے غربت کا شکار ہیں جو مناسب خوراک اور صاف پانی جیسی بنیادی ضروریات کے حصول سے محروم رہتے ہیں۔ یونیسف نے عالمی یوم اطفال پر جاری کردہ ایک رپورٹ میں خبردار کیا ہے کہ امدادی وسائل میں کمی، جنگوں اور موسمیاتی تبدیلی جیسے عوامل کے باعث مزید بچے غربت کے خطرے سے دوچار ہیں کہ یہ بحران صحت اور بہبود سے متعلق بنیادی خدمات تک بچوں کی رسائی میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق، کم اور متوسط درجے کی آمدنی والے ممالک میں 20 فیصد بچے اپنی صحت، نشوونما اور فلاح کے حوالے سے کم از کم دو شعبوں میں شدید محرومی کا شکار ہیں۔ رپورٹ میں جن شعبوں کا جائزہ لیا گیا ہے ان میں تعلیم، صحت، رہائش، غذائیت، صفائی اور پانی شامل ہیں۔ یہ جائزہ کم اور متوسط درجے کی آمدنی والے 130 سے زیادہ ممالک کے اعداد و شمار کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے تاکہ بچوں میں کثیر الجہتی غربت کی شدت کو سمجھا جا سکے۔

بنیادی سہولیات سے محرومی

رپورٹ کے مطابق، بچوں میں کثیر الجہتی غربت کی بلند ترین شرح ذیلی صحارا افریقہ اور جنوبی ایشیا میں دیکھی گئی ہے۔ مثال کے طور پر، چاڈ میں 64 فیصد بچے دو یا زیادہ اقسام کی شدید محرومی کا سامنا کرتے ہیں اور تقریباً 25 فیصد بچے تین یا زیادہ محرومیوں کا شکار ہیں۔ صفائی ستھرائی ایسا شعبہ ہے جس میں محرومی سب سے زیادہ ہے۔ کم آمدنی والے ممالک میں 65 فیصد بچے بیت الخلا تک رسائی سے محروم ہیں، زیریں متوسط درجے کی آمدنی والے ممالک میں یہ شرح 26 فیصد جبکہ بالائی متوسط درجے کی آمدنی والے ممالک میں 11 فیصد ہے۔ یونیسف کی ایگزیکٹو ڈائریکٹر کیتھرین رسل کا کہنا ہے کہ وہ بچے جو غربت میں پروان چڑھتے ہیں اور اچھی غذائیت، مناسب صفائی ستھرائی اور رہائش جیسی بنیادی ضروریات سے محروم رہتے ہیں ان کی صحت اور نشوونما بری طرح متاثر ہوتی ہے۔

بچوں کی غربت میں اضافہ

رپورٹ میں یہ نشاندہی بھی کی گئی ہے کہ شدید محرومی کا شکار بچوں کی تعداد میں کمی کی رفتار سست ہوتی جا رہی ہے۔ جنگوں، موسمیاتی اور ماحولیاتی بحران، آبادی میں تبدیلی، بڑھتے قومی قرضے اور ٹیکنالوجی تک رسائی میں عدم مساوات جیسے عوامل غربت میں اضافے کا باعث بن رہے ہیں۔ تاہم، رپورٹ یہ بھی واضح کرتی ہے کہ بچوں کی غربت کا خاتمہ ممکن ہے۔ دنیا میں 19 فیصد سے زیادہ بچے انتہائی مالی غربت کا سامنا کر رہے ہیں جو روزانہ تین امریکی ڈالر سے بھی کم رقم پر گزارا کرتے ہیں۔ رپورٹ میں بچوں کی غربت کے خاتمے کے لیے کئی اہم اقدامات پر زور دیا گیا ہے جن میں بچوں کی ضروریات کو قومی ترجیح دینا، انہیں معاشی پالیسیوں اور بجٹ میں موثر طور پر شامل کرنا، خاندانوں کے لیے سماجی تحفظ کے پروگراموں خصوصاً نقد امداد کی فراہمی کو مضبوط بنانا، بنیادی عوامی خدمات تک رسائی میں توسیع اور والدین و سرپرستوں کے لیے باعزت روزگار کے مواقع پیدا کرنا شامل ہیں تاکہ ان کی معاشی حالت بہتر ہو سکے اور بچے زیادہ محفوظ اور بااختیار ماحول میں پروان چڑھ سکیں۔

(بشکریہ یو این خبرنامہ)

تعلیم

اسامیاں خالی ہیں

نوشکی نوشکی ڈسٹرکٹ کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے بوائز ڈگری کالج نوشکی میں 75 سیکشن اسامیوں میں سے 55 استاتذہ کی اسامیاں خالی ہیں جو کہ محکمہ تعلیم اور عوامی نمائندوں کی کارکردگی پر سوالیہ نشان ہے۔ صوبائی حکومت بلوچستان میں تعلیم کے فروغ کے لیے بلند بانگ دعوے کرتے نہیں تھکتی لیکن دوسری جانب صوبائی دارالحکومت کوئٹہ کے قریبی ڈسٹرکٹ نوشکی کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے میں گزشتہ طویل عرصہ سے 55 استاتذہ اکرام کی اسامیاں خالی ہونے کی وجہ سے ہزاروں طلباء کا مستقبل داؤ پر لگا ہوا ہے۔ بوائز ڈگری کالج نوشکی میں گزشتہ تین ماہ سے پی ٹی سی ایل کیبل کٹ جانے کی وجہ سے کالج کے اسٹاف اور طلباء کو معمولی کام کے لیے بھی تین کلومیٹر دور نوشکی شہر جانا پڑتا ہے جس سے کی وجہ سے استاتذہ کرام، اسٹاف، اور طلباء کو مالی مصائب، مشکلات اور وقت کے ضیاع کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نوشکی کے طلباء نے صوبائی حکومت، محکمہ تعلیم کے ارباب اختیار، عوامی نمائندوں اور انسانی حقوق کی تنظیموں کی توجہ اس مسئلہ کی جانب مبذول کراتے ہوئے مطالبہ کیا ہے کہ بوائز ڈگری کالج نوشکی میں تمام خالی اسامیوں پر تقرریاں اور نیٹ بحال کرنے کے لیے ترجیحی بنیادوں پر اقدامات کر کے ہزاروں طلباء کو تعلیم کی سہولیات کی فراہمی ممکن بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔

(محمد سعید)

بیٹی کی تعلیمی اسناد کو جلا دیا

جمرود ضلع خیبر کے علاقے جمرود میں ملک نظیر خان مدوخیل نے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفس زنانہ کے سامنے شدید احتجاج کرتے ہوئے اپنی بیٹی کی تعلیمی اسناد کو آگ لگا دی۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی بیٹی میرٹ پر پورا اُترتی ہے، اس کے باوجود اسے صرف اس لیے نظر انداز کیا جا رہا ہے کہ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفس میں تقرریاں رشوت کے عوض کی جا رہی ہیں۔ ملک نذیر خان نے بتایا کہ گزشتہ چھ ماہ سے وہ اپنی بیٹی کو اپنے خرچے پر تعلیم دلوا رہے ہیں، لیکن جب ان کے اپنے سکول میں فی میل ٹیچر کی آسامی خالی ہوئی تو ایجوکیشن آفس کے ذمہ دار افسران نے سست روی اور ناانصافی سے کام لیا، جس سے انہیں شدید مایوسی ہوئی۔ انہوں نے الزام لگایا کہ ڈی ای او ثمینہ غنی کو ایک سال قبل یہاں سے ٹرانسفر کیا گیا تھا لیکن مبینہ طور پر بھاری رقم کے عوض دوبارہ اسی عہدے پر تعینات کر دیا گیا، جو بدعنوانی کی واضح مثال ہے۔ انہوں نے وزیراعلیٰ خیبر پختونخوا سے مطالبہ کیا کہ ڈی ای او ثمینہ غنی کا فوری تبادلہ کیا جائے، شفاف انکوائری کمیشن بنایا جائے اور ان کی بیٹی کو انصاف فراہم کیا جائے۔ بصورتِ دیگر وہ مزید احتجاج پر مجبور ہوں گے۔

(مسعود شاہ)

ایچ آر سی پی شکایات سیل

ایچ آر سی پی شکایات سیل نے 1985ء میں کام شروع کیا جب کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے میں ایسا مخصوص سیل موجود نہیں تھا جو مظلوم لوگوں کی شکایات وصول کرتا ہو۔ اس وقت سے، ایچ آر سی پی پاکستان بھر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے ازالے کے لئے جدوجہد میں مصروف ہے۔

ایچ آر سی پی شکایت سیل کو ماہانہ سینکڑوں شکایات موصول ہوتی ہیں۔ ہم جو نہی خواتین کے خلاف تشدد، محکمہ جاتی مسائل، اقلیتوں کے حقوق، جبری شادیوں، جبری تبدیلی مذہب، جبری گمشدگیوں، سائبر جرائم اور دیگر تمام انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے متعلق شکایات وصول کرتے ہیں اور اس پر ایکشن لیتے ہیں۔ تاہم، مالی معاونت، سیاسی پناہ، جائیداد کے تنازعات یا ذاتی تنازعات سے متعلق شکایات ہمارے دائرہ کار سے باہر ہیں۔

طریقہ کار

جیسے ہی ہمیں شکایات موصول ہوتی ہیں ہم متعلقہ حکام سے رابطہ کرتے ہیں اور کیس پر کارروائی کا آغاز کر دیتے ہیں۔ ہمارا بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے ساتھ ایک براہ راست ریفرل نظام موجود ہے جس کا مقصد شکایت کے فوری ازالے کو یقینی بنانا ہے۔

ہم سے رابطہ کریں

اگر آپ نے کوئی شکایت درج کرانی ہے تو ہمیں کال کر سکتے ہیں، واٹس ایپ کر سکتے ہیں، ای میل بھیج سکتے ہیں یا خط ارسال کر سکتے ہیں۔
آپ اپنے قریبی ایچ آر سی پی شکایات ڈیسک میں بذات خود جا کر شکایت رجسٹر کروا سکتے ہیں اور کمپلینٹ آفیسر سے بذات خود بات کر سکتے ہیں۔

لاہور

ایوان جمہور۔107 ٹیپو بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور 54600
فون : +92 42 3586 4994, 3583 8341, 3586 5969
ای۔میل : hrcp@hrcp-web.org
ویب سائیٹ : www.hrcp-web.org
مرکز شکایات سیل
فون : +92 042 3584 5969
موبائل : + 92 0333 200 6800
ای میل: complaints@hrcp-web.org

کراچی

یونٹ نمبر 08، فلور 1
سٹیٹ لائف بلڈنگ نمبر 5 (الاکو ہاؤس)
عبداللہ ہارون روڈ
صدر، کراچی۔74400
فون : +92 21 3563 7131, 3563 7132
شکایات سیل (موبائل) : +92 315 111 6287
ای میل : karachi@hrcp-web.org

پشاور

43، گلشن اقبال لین
(نزد ارباب روڈ سٹاپ)
یونیورسٹی روڈ، پشاور
فون : +92 091 584 4253
شکایات سیل (موبائل) : +92 0318 950 0640
ای میل : peshawar@hrcp-web.org

اسلام آباد

آفس B-1، فلور 2
بلاک ڈی-12، (اوپر فیصل بینک)
جی 8، مرکز، اسلام آباد
فون : +92 51 835 1127
شکایات سیل (موبائل) : +92 333 569 4773
ای میل : islamabad@hrcp-web.org

کوئٹہ

فلیٹ نمبر C-6
کبیر بلڈنگ
ایم۔اے جناح روڈ، کوئٹہ
فون : +92 81 282 7869
شکایات سیل (موبائل) +92 306 294 6125
ای میل : quetta@hrcp-web.org

حیدرآباد

306- فائزہ آرکیڈ، (لوفٹ اینڈ میزانائن فلور)
نزد مسجد حاجی شاہ بخاری درگاہ
صدر کنٹونمنٹ، حیدرآباد
فون : +92 22 278 3688, 720 770
فیکس : +92 22 278 4645
شکایات سیل (موبائل) : +92 310 339 2222
ای میل : hyderabad@hrcp-web.org

ملتان

2511/5A ابدالی کالونی
نزد بریٹین سکول
ملتان
فون : +92 61 451 7217
شکایات سیل (موبائل) : +92 331 665 5529
ای میل : multan@hrcp-web.org

گلگت

آفس نمبر 8-9، رانگ یُل پلازہ
جماعت خانہ روڈ، ذوالفقار آباد کالونی،
جتیال، گلگت
موبائل : +92 0344 547 5553
شکایات سیل (موبائل) : +92 355 454 1088
ای میل : gilgit@hrcp-web.org

تربت/مکران

پرواز ہاؤس،
بالمقابل علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی
پسنی روڈ، تربت، کیچ
فون : +92 852 413 365
شکایات سیل (موبائل) : +92 323 234 2406
ای میل : turbat@hrcp-web.org

Human Rights Commission of Pakistan
جہدِ حق
پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق جہدِ حق کے تمام قارئین کو آگاہ کرنا چاہتا ہے کہ
یہ رسالہ مفت ہے۔ قارئین کو کسی قسم کی قیمت ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے

انسانی حقوق کا عالمی منشور

10 دسمبر 1948ء کو اقوام عالم نے انسانی حقوق کا مندرجہ ذیل عالمی منشور منظور کیا

دفعہ - 1: تمام انسان آزاد اور حقوق و عزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوئی ہے۔ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔

دفعہ -2: ہر شخص ان تمام آزادیوں اور حقوق کا مستحق ہے جو اس اعلان میں بیان کیے گئے ہیں اور اس حق پر نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب اور سیاسی تفریق کا یا کسی قسم کے عقیدے، قومیت، معاشرے، دولت یا خاندانی حیثیت وغیرہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

اس کے علاوہ کسی بھی شخص کے ساتھ اس کے علاقے یا ملک کی، سیاسی، عملی یا بین الاقوامی حیثیت کی بناء پر کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ ملک یا علاقہ آزاد ہو یا تولیتی ہو یا غیر مختار ہو یا اقدار اعلی کے لحاظ سے کسی اور بندش کا پابند ہو۔

دفعہ - 3: ہر شخص کو اپنی آزادی، زندگی اور تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 4: کوئی شخص، غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جا سکے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی، چاہے اس کی کوئی بھی شکل ہو، ممنوع ہوگی۔

دفعہ - 5: کسی شخص کو جسمانی اذیت، یا ظالمانہ انسانیت سوز، یا ذلت آمیز سزا نہیں دی جائے گی۔

دفعہ - 6: ہر شخص کا حق ہے کہ ہر جگہ اس کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔

دفعہ - 7: قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور سب بغیر کسی تفریق کے قانون کے اندر امان پانے کے برابر کے حق دار ہیں۔ اس اعلان کی خلاف ورزی میں جو بھی تفریق کی جائے یا جس تفریق کی بھی ترغیب دی جائے، اس سے بچاؤ کے سب برابر کے حقدار ہیں۔

دفعہ - 8: ہر شخص کو ان فعال کے خلاف جو دستور یا قانون میں دیے ہوئے بنیادی حقوق کی نفی کرتے ہوں، با اختیار قومی عدالتوں سے موثر طریقے سے چارہ جوئی کرنے کا حق ہے۔

دفعہ - 9: کسی شخص کو من مانے طور پر گرفتار، نظر بند، یا جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 10: ہر شخص کو یکساں طور پر حق حاصل ہے کہ اس کے حقوق و فرائض کے تعین یا اس کے خلاف کسی عائد کردہ جرم کے فیصلے کے بارے میں اسے ایک آزاد اور غیر جانب دار عدالت میں کھلی اور منصفانہ سماعت کا موقع ملے۔

دفعہ - 11: (1) ایسے ہر شخص کو جس پر کوئی فوجداری الزام عاید کیا جائے، اس وقت تک بے گناہ شمار کیے جانے کا حق ہے جب تک کہ اس پر کھلی عدالت میں قانون کے مطابق جرم ثابت نہ ہو جائے اور اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع اور تمام ضمانتیں نہ دی جا سکی ہوں۔

(2) کسی شخص کو کسی ایسے فعل یا فروگزاشت کی بناء پر جو ارتکاب کے وقت قومی یا بین الاقوامی قانون کے اندر تعزیری جرم شمار نہیں کیا جاتا تھا، کسی تعزیری جرم میں ماخوذ نہیں کیا جائے گا، اور نہ ہی اسے کوئی ایسی سزا دی جائے گی جو جرم کے ارتکاب کے وقت کی مقرر کردہ سزا سے زائد ہو۔

دفعہ - 12: کسی شخص کی نجی زندگی، خانگی زندگی، گھر بار، خط و کتابت میں من مانے طریقے پر مداخلت نہ کی جائے اور نہ ہی اس کی عزت اور نیک نامی پر حملے کیے جائیں گے۔ ہر شخص کو ایسے حملے یا مداخلت سے قانونی تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 13: (1) ہر شخص کو اپنی ریاست کی حدود کے اندر نقل و حرکت کرنے اور کہیں بھی سکونت اختیار کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی ملک سے چلا جائے چاہے یہ ملک اس کا اپنا ہو اور اسی طرح اسے اپنے ملک میں واپس آ جانے کا بھی حق ہے۔

دفعہ - 14: (1) ہر شخص کو عقیدے کی بنا پر ایذا رسانی سے بچنے کے لیے دوسرے ملکوں میں پناہ حاصل کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔

(2) یہ حق ان عدالتی کاروائیوں سے بچنے کے لیے استعمال میں نہیں کیا جا سکتا جو خالصتاً غیر سیاسی جرائم یا ایسے افعال کی وجہ سے عمل میں آتی ہیں جو اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف ہیں۔

دفعہ - 15: (1) ہر شخص کو قومیت کا حق ہے۔

(2) کوئی شخص محض من مانے طور پر قومیت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اس کو اپنی قومیت تبدیل کرنے کا حق دینے سے انکار کیا جائے گا۔

دفعہ - 16: (1) بالغ مردوں اور عورتوں کو بغیر ایسی پابندی کے جو نسل، قومیت، یا مذہب کی بنا پر لگائی جائے شادی بیاہ کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے۔ مردوں اور عورتوں کو نکاح، ازواجی زندگی اور نکاح کو فسخ کرنے کے معاملے میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔

(2) نکاح فریقین کی پوری آزادی اور رضامندی سے ہوگا۔

(3) خاندان، معاشرے کی فطری اور بنیادی اکائی ہے اور وہ معاشرے اور ریاست دونوں کی طرف سے حفاظت کا حقدار ہے۔

دفعہ - 17: (1) ہر انسان کو تنہا یا دوسروں سے مل کر جائیداد رکھنے کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو زبردستی اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 18: ہر انسان کو آزادی فکر، آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب اور عقیدے کو تبدیل کرنے اور اجتماعی یا انفرادی طور پر خاموشی یا کھلے بندوں اپنے عقیدے کی تبلیغ، اس پر عمل، اور اس کی عبادات اور رسومات پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

دفعہ - 19: ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اور بلا کسی قسم کی مداخلت کے اپنی رائے پر قائم رہے اور جس ذریعے سے چاہے اور ملکی سرحدوں کے حائل ہوئے بغیر معلومات اور خیالات کا حصول اور ان کی ترسیل کرے۔

دفعہ - 20: (1) ہر شخص کو پر امن طریقے سے ملنے جلنے اور انجمنیں قائم کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو کسی انجمن میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

دفعہ - 21: (ا) ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طور پر منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق ہے۔

(3) عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی۔ یہ مرضی وقتاً فوقتاً ایسے حقیقی انتخابات کے ذریعے ظاہر کی جائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی کی بنیاد پر ہوں گے اور جو خفیہ ووٹ یا اس کے مماثل کسی دوسرے آزادانہ طریقہ رائے دہندگی کے مطابق عمل میں آئیں گے۔

دفعہ - 22: معاشرے کے رکن کی حیثیت سے ہر شخص کو معاشرتی تحفظ کا حق حاصل ہے اور یہ حق بھی وہ ملک کے نظام اور وسائل کے مطابق قومی کوشش اور بین الاقوامی تعاون سے ایسے اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کو عملاً حاصل کرے، جو اس کی عزت اور شخصیت کی آزادانہ نشوونما کے لیے لازم ہیں۔

دفعہ - 23: (1) ہر شخص کو کام کاج، روزگار کے آزادانہ انتخاب، کام کاج کی مناسب و معقول شرائط اور بے روزگاری کے خلاف تحفظ کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو کسی تفریق کے بغیر مساوی کام کے لیے مساوی معاوضے کا حق ہے۔

(3) ہر شخص جو کام کرتا ہے وہ ایسے مناسب و معقول مشاہرے کا حق رکھتا ہے جو خود اس کے اور اس کے اہل و عیال کے لیے باعزت زندگی کا ضامن ہو اور جس میں اگر ضروری ہو تو معاشرتی تحفظ کے دوسرے ذریعوں سے اضافہ کیا جا سکے۔

(4) ہر شخص کو اپنے مفاد کے بچاؤ کے لیے تجارتی انجمنیں، (ٹریڈ یونین) قائم کرنے اور اس میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے۔

دفعہ - 24: ہر شخص کو آرام اور فرصت کا حق ہے جس میں کام کے گھنٹوں کی حد بندی اور تنخواہ کے ساتھ مقررہ وقفوں پر تعطیلات میں شامل ہیں۔

دفعہ - 25: (1) ہر شخص کو اپنی اور اپنے اہل و عیال کی صحت اور فلاح و بہبود کے لیے مناسب معیار زندگی کا حق ہے جس میں خوراک، پوشاک، مکان اور علاج کی سہولتیں اور دوسری ضروری معاشرتی مراعات، اور بیروزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپا اور ان حالات میں روزگار سے محرومی جو اس کے قبضہ قدرت سے باہر ہوں، کے خلاف تحفظ کا حق شامل ہے۔

(2) زچہ اور بچہ خاص توجہ اور امداد کے حق دار ہیں۔ تمام بچے خواہ وہ شادی کے بغیر پیدا ہوئے ہوں یا شادی کے بعد، معاشرتی تحفظ سے یکساں طور پر مستفید ہوں گے۔

دفعہ - 26: (1) ہر شخص کو تعلیم کا حق ہے۔ تعلیم کم سے کم ابتدائی اور بنیادی درجوں میں مفت ہوگی۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی۔ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کا عام انتظام کیا جائے گا اور لیاقت کی بنا پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا سب کے لیے مساوی طور پر ممکن ہوگا۔

(2) تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی پوری نشوونما ہوگا اور وہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ وہ تمام قوموں اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت، رواداری اور دوستی کو ترقی دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔

(3) والدین کو اس بات کے تصفیہ کا اولین حق ہے کہ ان کے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائے گی۔

دفعہ - 27: (1) ہر شخص کو قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے، فنون لطیفہ سے مستفید ہونے اور سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد میں شرکت کا حق حاصل ہے۔

(2) ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے ان اخلاقی اور مادی مفادات کا تحفظ کیا جائے جو اسے ایسی سائنسی، فنی یا ادبی تصنیف سے، جس کا وہ مصنف ہے، حاصل ہوتے ہیں۔

دفعہ - 28: ہر شخص ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی نظام کا حقدار ہے جس میں وہ تمام آزادیاں اور حقوق حاصل ہو سکیں جو اس اعلان میں شامل ہیں۔

دفعہ - 29: (1) ہر شخص پر معاشرے کے حق ہیں کیونکہ معاشرے میں رہ کر اس کی شخصیت کی آزادانہ اور پوری نشوونما ممکن ہے۔

(2) اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہوگا جو دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرانے اور ان کا احترام کرانے کی غرض سے اور ایک جمہوری نظام میں اخلاق، امن عامہ اور عام فلاح و بہبود کے مناسب لوازمات کو پورا کرنے کے لیے قانون کی طرف سے عائد کی گئی ہوں۔

(3) یہ حقوق اور آزادیاں کسی حالت میں بھی اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف عمل میں نہیں لائی جا سکتیں۔

دفعہ - 30: اس اعلان کی کسی چیز سے کوئی ایسی بات مراد نہیں لی جا سکتی جس سے کسی ملک، گروہ یا شخص کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے یا کسی ایسے کام کو انجام دینے کا حق پیدا ہو جس کا منشا ان حقوق اور آزادیوں کی نفی ہو جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔

پبلشر: ندیم فاضل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق
"ایوان جمہور" 107۔ ٹیپو بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور
فون: 35838341-35864994 فیکس: 35883582
ای میل hrcp@hrcp-web.org ویب سائٹ: www.hrcp-web.org
پرنٹر: مکتبہ جدید پریس، 14 ایمپرس، لاہور Registered No. LRL-15
کمپوز: جمال احمد سید رضا شاہ